رجسٹرڈ نمبر اے ۴۰۶۶

سیدہ محسن

# نگار

قیمت فی کاپی ۱۰ر

# تصانیف نیاز فتحپوری

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کیلئے ختم کر دینے والی
انجیل انسانیت

## "من و یزداں"

مولانا نیاز فتحپوری کی ۴۰ سالہ دور تصنیف و صحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوع انسانی کو "انسانیت کبریٰ و اخوتِ عامہ" کے ایک رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دیگئی ہے اور جس میں مذاہب کی تخلیق، دینی عقائد رسالت کے مفہوم اور صحایف مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی اخلاقی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت بلند انشاء اور پر زور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے۔

ضخامت ۲۰۰ صفحات۔ مجلد رسات روپیہ آٹھ آنے (معہ) علاوہ محصول

مذہبی استفسارات و جوابات
یعنی

## من و یزداں کا دوسرا حصّہ

اس حصّہ میں جن مسایل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے انکی مختصر فہرست یہ ہے:۔ اصحاب کہف ۔ معجزہ و کرامت ۔ انسان مجبور ہے یا مختار ۔ مذہب و عقل ۔ طوفان نوح ۔ خضر کی حقیقت ۔ مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں۔ یونس اور وہان ماہی ۔ حسن یوسف کی داستان ۔ قارون ۔ سامری ۔ علم غیب ۔ دعاء توبہ ۔ لقمان ۔ عالم برزخ ۔ یاجوج ماجوج ۔ ہاروت و ماروت ۔ حوض کوثر ۔ امام مہدی ۔ نور محمدی اور پل صراط ۔ آتش نمرود وغیرہ

ضخامت ۴۲۴ صفحات۔ کاغذ سفید و دبیز۔
قیمت علاوہ محصول یا بخرد روپیہ آٹھ آنے

### نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کیا اسکا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اسکے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔ اس اڈیشن میں متعدد افسانے و ادبی مقالات ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے اڈیشنوں میں نہ تھے۔ اس لئے ضخامت بھی زیادہ ہے۔

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

### جمالستان

اڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں حسن بیان قدرت اور باکیزگی خیال کے بہترین نمونے ملیں گے۔ ملک کے بہت سے اجتماعی و معاشرتی مسایل کا حل بھی نظر آئے گا ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے اس اڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے اڈیشنوں میں نہ تھے

قیمت پانچ روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

### حسن کی عیاریاں

اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخ اور انشاء لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئے گا اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہوگا کہ تاریخ کے جھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں حضرت نیاز کی انشاء نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔

قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

### ترغیبات جنسی یا
### شہوانیات مجلد

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات کی تاریخی و نفسیاتی اہمیت نہایت شرح و بسط کے ساتھ محققانہ نظر سے کیا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس طرح رائج ہوئی نیز کہ مذاہب عالم نے اس رواج میں کتنی مدد کی اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے نیا اڈیشن۔

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

# دی مغل لائن لمیٹیڈ

سب سے پُرانی ہندوستانی جہازراں کمپنی

## بحرِ احمر اور ماریشس

کی بندرگاہوں کو مسافروں اور مال لیجانے والے جہازوں کا بیڑہ

---

## بمبئی سے

## عدن، جدّہ، پورٹ سوڈان اور مصر

کی بندرگاہوں کے درمیان ہمارے جہازوں کی آمدورفت باقاعدگی
اور خوش اسلوبی سے ہوتی ہے اور امید ہے کہ ضرورت پڑنے پر
دوسری بندرگاہوں کو بھی اپنے جہاز روانہ کر سکیں گے

مزید معلومات کے لئے
حسب ذیل پتہ پر لکھئے

## ٹرنر مارسین اینڈ کمپنی لمیٹیڈ

۱۶ - بنک اسٹریٹ بمبئی

# اب بھی وقت ہے

کہ آپ "من و یزداں" کے دونوں حصے تیرہ روپے (۱۳ء) میں معہ محصول حاصل کر سکیں گے۔ ورنہ غالباً دو ماہ کے بعد آپ کو یہ کتاب کسی قیمت پر نہ مل سکے کیونکہ اب صرف ۱۰۰ نسخے اس کے باقی رہ گئے ہیں اور آئندہ اتنی بڑی کتاب کا چھپنا آسان نہیں "من و یزداں" ایک صحیفۂ انسانیت ہے جس کے مطالعہ کے بغیر آپ مذہب کی صحیح روح نہیں سمجھ سکتے۔ منیجر نگار

رعایتی قیمت

# مجموعۂ استفسار و جواب

کی تیسری جلد

ضخامت ۵۰۰ صفحات۔ جس کی قیمت علاوہ محصول تین روپیہ ہے لیکن اب آپ کو معہ محصول صرف دو روپیہ میں مل سکتی ہے۔ منیجر نگار

# نگار کی جلدیں

جولائی تا دسمبر ۳۲ء ۔ سنہ ۳۹ء مکمل علاوہ محصول ڈاک ۵ء ۱۰ء

سنہ ۴۰ء تا سنہ ۵۰ء کی مکمل جلدیں فی جلد ۱۰ء علاوہ محصول

منیجر نگار لکھنؤ

# کھانسی کو روکئے

## اِس سے آگے خطرہ ہے!

• کھانسی کو معمولی سمجھ کر نظر انداز نہ کیجئے۔ یہی کھانسی اگر بڑھ جائے تو بے حد خطرناک نتائج پیدا کر سکتی ہے۔ اس سے کھانسی کے شروع ہوتے ہی اسے روکئے۔

# سعالین

کی ایک گولی منہ میں رکھ کر آہستہ آہستہ چوسئے یہ نہ صرف گلے کی خراش کو روکے گی کھانسی کو دور کرے گی طبیعت کو سکون بخشے گی بلکہ سانس کی نالیوں کو صاف کر کے نظام میں توازن پیدا کرے گی اور سانس کو خوشگوار بنائے گی۔

قیمت فی شیشہ صرف ۱۲ آنے

ہمدرد دواخانہ دہلی

# ایک نہایت ضروری اعلان

## (قارئین نگار اور ایجنٹ صاحبان کی خدمت میں)

عام طور پر جو کاغذ رسایل و اخبارات میں استعمال کیا جاتا ہے اسے "نیوز پرنٹ" کہتے ہیں، یہ کاغذ ہندوستان میں اس سے پہلے کبھی کبھی طیار نہیں ہوتا تھا اور نہ اب ہوتا ہے، زیادہ تر ناروے سے آتا تھا اور اسی لئے اس کا دوسرا نام "ناروے کا کاغذ" بھی تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے زمانہ میں ناروے سے اس کی آمد بند ہو گئی اور کناڈا نے مہیا کرنا شروع کیا، چنانچہ اب اس کاغذ کی بہت بڑی منڈی کناڈا ہی ہے اور وہیں سے ہندوستان کو بھی فراہم کیا جاتا تھا، لیکن اب صورتِ حال بدل گئی ہے اور وہ یہ کہ جنگ کوریا کی وجہ سے چونکہ امریکہ کو اس کاغذ کی ضرورت زیادہ ہے، اس لئے کناڈا کا بنا ہوا کاغذ تقریباً سب کا سب امریکہ چلا جاتا ہے اور ہندوستان میں اس کا میسر آنا مشکل ہو گیا ہے۔ چنانچہ اس وقت حالت یہ ہے کہ بازار میں کاغذ کمیاب ہوتے ہوتے نایاب ہوتا جا رہا ہے اور اگر بلیک مارکیٹ سے تھوڑا بہت مل بھی جاتا ہے تو اتنی گراں قیمت پر کہ اس کا حاصل کرنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔

آپ کو کاغذ کی گرانی کا اندازہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ یہی نیوز پرنٹ جس کی قیمت کسی وقت صرف ڈھائی روپیہ ریم تھی، اب بازار میں اٹھارہ روپیہ فی ریم حساب سے بھی نہیں ملتا اور اخبارات و رسایل پر اس گرانی و نایابی کا بہت بڑا اثر پڑ رہا ہے۔ اسی کے ساتھ پبلک کے ذوق کا یہ عالم ہے کہ اگر کوئی رسالہ یا اخبار قیمت میں ایک روپیہ کا بھی اضافہ کر دے تو وہ اسے گوارا نہ کریگی اور خریداری بند کر دیگی۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ نگار کی گزشتہ ۳۰ سال کی تاریخ میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ پرچہ وقت پر شایع نہ ہوا ہو یا کسی مہینہ ناغہ ہوا ہو لیکن اب کہ کاغذ بازار میں نہایت دشواری سے دستیاب ہوتا ہے اور وہ بھی حد درجہ گراں قیمت پر، اس لئے اس کا امکان ہے کہ کسی وقت (جب ہمارے تمام ذرایع فراہمی کاغذ کے لئے ختم ہو جائیں) ہم رسالہ کا حجم کم کرنے پر مجبور ہوں، گو ہم کوشش تو یہی کر رہے ہیں کہ اس کی نوبت نہ آئے، لیکن اگر کبھی ایسا ہو تو قارئین کرام کو ہماری مجبوریوں کے پیش نظر اسے گوارا کرنا چاہئے۔ حجم کے کم ہونے کی صورت میں ہم رسالہ کا مسطر اور خط گنجان کر دیں گے تاکہ جس حد تک مضامین کا تعلق ہے ان میں کمی نہ ہو اور وہی ۶۴ صفحات کا مواد ان کو فراہم ہوتا رہے۔

منیجر نگار

## پاکستان میں نگار و ہماری کتابیں حاصل کرنے کا طریقہ

پاکستانی حضرات خواہ وہ ایجنٹ ہوں یا نگار کے خریدار یا دوسرے کرمفرما ہماری کتابیں اس طرح حاصل کر سکتے ہیں کہ وہ اپنی مطلوبہ کتابوں کی فہرست ہمارے پاس بھیجدیں، ہم کتابیں ان کو ذریعہ رجسٹری بھیجدیں گے اور وہ ان کی قیمت ہمارے حسب ذیل نمایندوں میں سے کسی کو دست بدست دیدیں گے یا ذریعہ منی آرڈر بھیجدیں گے۔

(۱) ڈاکٹر ظفر عباس ہاشمی - ۲۲۲ پیر الٰہی بخش کالونی متصل ہائی اسکول کراچی - ۲۔ حکیم اقبال حسن صاحب متصل دربار داتا گنج بخش لاہور

# نگار

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۵۹ | فہرست مضامین مارچ ۱۹۵۱ء | شمار ۳



ملاحظات ---------- ۴

ترقی پسند تحریک ----- غلام سرور ام۔اے -- ۹

ہندوستان کا اولین ریاضی داں ... کلیم سہسرامی --- ۲۱

اُردو کا پہلا واسوخت ... سید شاہ ولی الرحمٰن ولی۔ ایم۔اے ۲۵

دُنیا کے مہاجرین ---------- ۳۴

آرٹ کی ماہیت اور آغاز ... حنیف فوق ام۔اے۔ ۳۶

باب الاستفسار۔ رویتِ ہلال، باؤلے کتے، زندگی کی قدریں۔ ۴۴

دوزخ (نظم) ... افسر سہاپی احمد نگری ..... ۵۰

تخلیقِ آدم (نظم) ... عبدالہادی رفعت ---- ۵۱

اہرمن زار (نظم) ... فضا ابن فیضی ------ ۵۲

منظومات ... نازش پرتاب گڈھی صفیہ شمیم سید شاہ ولی الرحمٰن ایم اے ۵۵

مطبوعات موصولہ ---------- ۵۶


## ملاحظات

## یہ ہے ہندوستان اور یہ ہے چین!

**یہ ہے ہندوستان!** جس کو آزاد ہوئے تین سال سے زاید ہو چکا، لیکن آزادی کی سچی خوشی اس وقت تک کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔ اس میں شک نہیں کہ کسی ملک کی آزادی کے ساتھ سب سے پہلا تصور جو انسان کے ذہن میں قایم ہوتا ہے وہ اس احساس سے وابستہ ہے کہ حکومت ہماری ہے، لیکن اس تصور کے ساتھ سچی خوشی پیدا ہوتی ہے اس یقین کے ساتھ کہ ملک کی اقتصادی بدحالی (جس کا سبب غیر ملکی حکومت کے استحصال کو قرار دیا جاتا ہے) ختم ہو جائے گی اور ملک کی آبادی اطمینان و سکون کی زندگی بسر کرے گی۔

یہ تھا وہ یقین جس نے ہندوستان کے عوام کو آزادی کی جنگ پر آمادہ کیا اور یہ تھی وہ امید جو ملک نے کانگریس حکومت سے قایم کی تھی۔ لیکن تین سال کا تجربہ بتاتا ہے کہ حکومت اب تک اپنا اعتماد قایم کرنے میں کامیاب نہیں ہوئی اور اقتصادی دشواریاں روز بروز

بڑھتی جارہی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ آزادی کے بعد سے حکومت کو چند در چند مشکلات کا مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے جو داخلی و خارجی سیاست دونوں سے تعلق رکھتی ہیں اور عالمگیر اقتصادی بدحالی کا اثر قدرتاً ہندوستان پر بھی پڑنا چاہیئے، لیکن غالباً حکومت کو بھی اعتراف کرنا پڑے گا کہ جو تدابیر ان مشکلات کے ازالہ کے لئے اختیار کی جارہی ہیں، ان میں سے اسوقت تک کوئی کامیاب نہیں ہوئی اور اسی لئے مستقبل کی طرف سے ملک میں عام مایوسی پیدا ہوتی چلی جارہی ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ حکومت سرمایہ داروں کی حامی ہے اور ان کی دولت سے مرعوب ہے، حکومت کا دعویٰ ہے کہ وہ جنتا کی طرفدار ہے اور ان کی فلاح و بہبود اس کا اصل مقصد ہے، لیکن کس قدر افسوس کی بات ہے کہ نہ سرمایہ دار حکومت سے خوش ہے نہ جنتا بلکہ ہندوستان کا کوئی طبقہ ایسا نہیں جو حکومت کا شاکی نہ ہو۔

مسلمانوں کو چھوڑیئے کہ ممکن ہے کہ ان کی مشکلات کا سبب زیادہ تر ذہنی ہو، لیکن آپ ہندوؤں کو کیا کہیں گے جن کی یہاں اکثریت ہے اور جو جائز طور پر کہہ سکتے ہیں کہ حکومت انھیں کی ہے، لیکن میں نے ہندوؤں کے مختلف طبقات کے خیال معلوم کرنے کی کوشش کی اور مجھے کسی طبقہ کا کوئی انسان ایسا نہیں ملا جس نے حکومت کو اچھے الفاظ سے یاد کیا ہو۔

میں نے جہاں تک غور کیا ہے اس کا سبب صرف تجارتی و اقتصادی دشواریاں ہیں۔ زمیندار اس لئے برہم ہیں کہ انکی جایدادیں چھینی جارہی ہیں، کاشتکار اس لئے ناخوش ہیں کہ ان سے جبراً غلہ حاصل کیا جاتا ہے اور نئے نئے مطالبات ان پر عاید کئے جاتے ہیں، تجارت پیشہ جماعت اس لئے ناخوش ہیں کہ درآمد برآمد اور حصول لائسنس کی دشواریاں ان کی راہ میں حایل ہیں، مزدوروں کی شکایات یہ ہیں کہ جو مزدوری ان کو ملتی ہے وہ ان کی ضروریات زندگی کے لئے کافی نہیں ہوتی۔ متوسط طبقہ کو تو خیر پریشان ہونا ہی چاہیئے کہ ایک طرف اس غریب کی آمدنی بہت محدود ہے اور دوسری طرف اشیاء کی گرانی ناقابل برداشت حد تک بڑھتی جارہی ہے

ہم سمجھتے ہیں کہ عہد حاضر کی یہ الجھنیں حکومت کی پیدا کی ہوئی نہیں ہیں، لیکن عوام کسی منطق و استدلال کو نہیں سنتے، وہ تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ انھیں کھانے کو غلہ، تن ڈھانکنے کو کپڑا ملتا رہے اور جب ان کا یہ مطالبہ پورا نہ ہوگا تو ان میں رفتہ رفتہ بے چینی پیدا ہوگی۔

اب غور کیجیے کہ حکومت نے اس مسئلہ کا حل کیا سوچا اور وہ کس حد تک اس میں کامیاب ہوئی۔ سب سے پہلے غلہ کو لیجیے کہ یہی اولین ضرورت انسان کی ہے۔ چونکہ ہندوستان میں غلہ کی پیداوار اس کی آبادی کے لحاظ سے کم ہے اس لئے حکومت نے زیادہ غلہ اگانے کی اسکیم کو چلایا لیکن لاکھوں روپیہ صرف کرنے کے بعد بھی اس میں کامیابی نہیں ہوئی، یہاں تک کہ راشن بجائے بڑھنے کے اور کم ہوگیا۔ کپڑے کے کارخانے ہندوستان میں بہت ہیں اور کثیر مقدار میں کپڑا یہاں طیار ہوتا ہے، لیکن غریبوں کی دسترس سے بالکل باہر۔ دودھ گھی وغیرہ کا کوئی سوال ہی نہیں کیونکہ اول تو حکومت اس کا انتظام نہیں کرسکی کہ یہ چیزیں خالص مل سکیں اور اگر ملیں بھی تو لعراء کے سوا کسی اور کو نہیں میسر ہوسکتیں۔ مختلف قسم کے ٹیکسوں کی تعداد برابر بڑھتی جارہی ہے، ریل کا کرایہ پہلے سے دوچند کردیا گیا ہے اور انصاف حاصل کرنے کے مصارف رشوت ستانی کی وجہ سے بہت زیادہ ہوگئے ہیں، الغرض زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جسکی طرف سے ملک کو اطمینان ہو اور اسی لئے حکومت کی طرف سے بدظنی بڑھتی جارہی ہے۔

حکومت ان حالات سے بخوبی واقف ہے، لیکن چونکہ اسے نہ ایڈمنسٹریشن کا تجربہ حاصل ہے اور نہ اس کے عمال میں اس کی اہلیت پائی جاتی ہے، اس لئے ہر شعبہ میں بدنظمی پھیلی ہوئی ہے اور راعی و رعایا کے درمیان جو رشتۂ اعتماد پیدا ہونا چاہئے وہ بالکل مفقود ہے۔

---

**یہ چین ہے!** چین کو سامراجی گرفت سے آزاد ہوئے کم و بیش صرف ایک سال ہوا ہے، لیکن اسی قلیل مدت میں اس نے جو ترقی و اصلاح کی ہے، حد درجہ حیرتناک ہے۔ ایک سال قبل وہاں کمی پیداوار کی وجہ سے غذا کی قلت کا یہ حال تھا کہ کسی کو پیٹ بھر کھانے کو بھی نہ ملتا تھا، لیکن اب وہاں نہ صرف یہ کہ فقر و فاقہ ختم ہو گیا ہے، بلکہ پہلے سے بہتر غذا ہر شخص کو ملنے لگی ہے۔

پچھلے سال حکومت نے اندازہ کیا تھا کہ چین کا کسان زیادہ سے زیادہ ۵۰ لاکھ ٹن غلہ پیدا کر سکے گا۔ لیکن سال کے اختتام پر معلوم ہوا کہ اس نے ایک کروڑ ٹن سے زیادہ غلہ پیدا کر کے دکھا دیا ہے۔ روئی کی پیداوار میں بھی اتنا اضافہ ہو گیا ہے کہ وہاں، ہم کروڑ ۵۰ لاکھ آبادی کی ضرورتیں اس سے پوری ہو سکتی ہیں۔ اسی طرح چاء، ریشم اور سن وغیرہ کی پیداوار میں بھی غیر معمولی اضافہ نظر آتا ہے۔

لڑائی کے بعد وہاں یہ حالت تھی کہ دیہات میں سناٹا نظر آتا تھا، کھیت ویران، گھر لٹے ہوئے اور آبپاشی کے ذرائع بالکل درہم برہم ہو چکے تھے۔ بچے کھچے کسان جو کہیں کہیں رہ گئے تھے وہ خود اپنا پیٹ بھی نہ پال سکتے تھے۔ لیکن لڑائی ختم ہونے کے بعد کمیونسٹوں کی حکومت قایم ہوتے ہی بالکل رنگ بدل گیا کیونکہ اس نے سب سے پہلے زراعتی اصلاح کی طرف توجہ کی اور امتحاناً اس نے ایک ایسے رقبہ میں جس کی آبادی دو کروڑ ۶۰ لاکھ تھی، زمینداری و جاگیرداری ختم کر کے کسانوں کو کھیت کا مالک بنا دیا۔ لگان کم کر دیا، زمینداروں نے کسانوں سے جو کچھ وصول کیا تھا وہ بھی انھیں واپس دلا دیا۔ ۲۵ فیصدی زراعتی ٹیکس بھی کم کر دیا، ۷ لاکھ ٹن غلہ کی تقاوی بھی تقسیم کی اور پیداوار غلہ کے لحاظ سے بازار کے اشیاء کا نرخ بھی مقرر کر دیا، ٹریکٹروں کے ذریعہ سے مزید پیداوار پر کوئی ٹیکس قایم نہیں کیا۔ ذرایع آبپاشی کی مرمت و توسیع کے لئے نہروں اور دریاؤں کی صفائی، کھدائی اور بندوں کی مرمت کے لئے ۴۵ لاکھ کسانوں کو مامور کیا گیا۔ ان کے کام کا اندازہ یہ کیا گیا تھا کہ وہ ایک سال کے اندر ۳۵ کروڑ مکعب میٹر مٹی کھود سکیں گے اور بندوں کی مرمت کے لئے ۱۲ لاکھ مکعب میٹر اینٹ گارا لا سکیں گے، لیکن وہاں کے کسانوں نے جس غیر معمولی محنت سے کام کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ایک سال کے اندر انھوں نے اس سے دوچند مٹی کھود کر باہر پھینک دی جتنی ۹ سال کے اندر نہر پناما کی تعمیر کے وقت کھودی گئی تھی۔

۱۰ لاکھ ایکڑ زمین جو دریائے زرد کی طغیانی کی وجہ سے برباد ہو چکی تھی اور دس سال سے اس میں کاشت نہ ہوئی تھی، پھر کام میں لائی گئی۔ اس کے علاوہ ڈھائی لاکھ ایکڑ زمین جو بنجر پڑی ہوئی تھی اس میں بھی کاشت کی گئی اور آبپاشی سے غیر معمولی پیداوار حاصل کی گئی۔

حکومت نے ۱۹۵۰ء کے لئے ۴ کروڑ پودے نصب کرنے کی تجویز پیش کی تھی، لیکن چینی آبادی نے اسے ۵۰ کروڑ تک پہنچا دیا۔

یہ چینی کاشتکار کی محنت کا صرف ایک پہلو ہے اس نے اس کے علاوہ اور بھی بہت کچھ کیا ہے۔ مثلاً کاشت کو

خراب کردینے والے کیڑوں کا مقابلہ، اچھی کھاد کی فراہمی، طریق زراعت کی اصلاح، نئے آلات کا استعمال، جانوروں کی اچھی نسل کشی یہ تمام باتیں نہایت وسیع پیمانے پر اختیار کی گئیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس وقت چین کا گاؤں ایک سال قبل کے گاؤں سے بالکل مختلف حیثیت رکھتا ہے اور اس کا اندازہ اس خط سے ہو سکتا ہے جو ایک کاشتکار نے صدر جمہوریہ چین کو حال ہی میں لکھا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ:۔ "اس سے قبل گاؤں کے بیس خاندانوں میں سے صرف دو گھرانے ایسے تھے جو پیٹ بھر کر کھانا کھا سکتے تھے، آج نہ صرف یہ کہ سارے گاؤں کے لئے غذا کی افراط ہے بلکہ ہزاروں من غلہ کا ذخیرہ ہمارے پاس موجود ہے اور ہماری پیداوار ۵۰ سے ۱۰۰ فی صدی تک زیادہ ہو گئی ہے۔ دودھ دینے والے جانور اور بھیڑوں کی تعداد بھی اب بہت کافی ہے"۔

ایک دوسرے گاؤں کا کسان لکھتا ہے کہ:۔ "اب سے قبل میرا خاندان گھاس پات پر زندگی بسر کرتا تھا، بدن پر چیتھڑوں کے سوا کچھ نہ تھا اور گھر بھر کے لئے صرف ایک ہی کمل تھا، لیکن اس وقت ہم میں سے ہر ایک کے پاس روئی کا لحاف ہے، غلہ کی فراوانی ہے اور مکان کے تین کمرے نئے بن گئے ہیں"۔

وہاں کے نوجوانوں کی نئی ڈماکریٹک لیگ نے پچھلے ایک سال میں جتنی ترقی کی ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اسکے ممبروں کی تعداد اس وقت ۳۰ لاکھ ہے۔

## تعلیمی ترقیاں

مزدوروں اور کسانوں کے لئے تمام ملک میں مختصر مدت تعلیم کے لئے علیحدہ مدارس بہ کثرت قایم کئے گئے ہیں، چنانچہ صرف شنگھائی میں ایسے مدارس کی تعداد ۱۱۲ ہے جن میں ۱۳۵۹۴ بچے مزدوروں اور کسانوں کے تعلیم پاتے ہیں اور جن کو حکومت سے وظیفہ ملتا ہے۔ ان کے علاوہ وہاں یونیورسٹیاں بھی قایم کی گئی ہیں جن میں ۶۳ فی صدی کسانوں اور مزدوروں کے بچے تعلیم پاتے ہیں۔

اس لیگ کے اخبارات بھی نکلتے ہیں جن میں سے "چائنا یوتھ" کی اشاعت ایک لاکھ ۳۰ ہزار ہے۔ یہ ادارہ کتابیں بھی شایع کرتا ہے چنانچہ پہلے سال اس نے ۱۳۷ کتابیں شایع کیں جن کی کاپیوں کی تعداد ۲۶ لاکھ تھی۔

اس وقت جمہوریت چین میں ابتدائی مدارس کی تعداد ۴ لاکھ ہے جن میں ۳ کروڑ طلبہ تعلیم پاتے ہیں۔ ثانوی مدارس کی تعداد ۳۶۹۰ ہے جن میں دس لاکھ نوے ہزار طلبہ تعلیم پا رہے ہیں۔ زیادہ بلند تعلیم کے اداروں کی تعداد ۲۲۷ ہے جن میں طلبہ کی تعداد ایک لاکھ ۴۳ ہزار ہے۔ ان مدارس میں سے ۶۱ فی صدی حکومت کے ہیں باقی پرائیویٹ ہیں۔

چین کی ۴۸ کروڑ آبادی کو دیکھتے ہوئے مدارس کی یہ تعداد بھی ناکافی ہے، لیکن ۴۹ء کے مقابلہ میں یہ تعداد ۶۰ فی صدی زیادہ ہے۔

---

ہندوستان کو جب آزادی ملی تو صدیوں سے اس پر کسی ملک نے حملہ نہ کیا تھا اور وہ بالکل منظم حالت میں تھا۔ چین جب آزاد ہوا تو اس حال میں کہ وہ خونریزی و غارتگری کا آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ ہندوستان کو آزادی ملی تو اس طرح جیسے کسی کو چلتی

ہوئی مشین مل جائے، چین کو آزادی ملی تو اس حال میں جیسے کسی کو کھنڈر سونپ دئے جائیں لیکن باوجود اس کے ہندوستان تین سال میں بھی کچھ نہ کر سکا اور چین نے ایک سال میں وہ کچھ کر دکھایا جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اس فرق کا سبب یہ ہو کہ چین نے اپنی آزادی اپنا خون بہا کر حاصل کی ہے اور ہندوستان کو یہ سعادت نصیب نہیں ہوئی۔

---

## ہندوستان و پاکستان کا تجارتی معاہدہ

اب سے تقریباً ڈیڑھ سال پہلے کی بات ہے کہ پاکستان و ہندوستان کے درمیان سکوں کی قیمت میں اختلاف پیدا ہو جانے کی وجہ سے دونوں ملکوں کے تجارتی تعلقات ختم ہو گئے تھے اور باہمی اختلاف کا ایک دروازہ اور کھل گیا تھا۔ لیکن شکر ہے کہ اب ہندوستان نے پاکستانی سکہ کی بڑھی ہوئی قیمت کو تسلیم کر کے تجارتی تعطل کو بڑی حد تک ختم کر دیا۔

اول اول جب ہندوستان نے اپنے سکہ کی قیمت کم کی تھی، ہم نے اسی وقت ظاہر کیا تھا کہ یہ پالیسی صحیح نہیں ہے۔ ہندوستان نے سمجھا تھا کہ ایک طرف وہ اپنے یہاں غلہ، روئی اور جوٹ کی پیداوار کو بڑھا کر چیزیں پاکستان سے حاصل کرنے پر مجبور نہ ہوگا اور دوسری طرف اپنی برآمد کو بڑھا کر اپنے مالیات میں توازن پیدا کر لے گا۔ اسی کے ساتھ اسے یہ خیال بھی تھا کہ پاکستان شاید اپنے سکہ کی قیمت کم کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔ پھر یہ تو ضرور ہوا کہ ہندوستان کی برآمد کچھ بڑھ گئی، لیکن باقی دو باتیں پوری نہ ہو سکیں، یعنی نہ وہ اپنے یہاں کی پیداوار کو بڑھا سکا اور نہ پاکستان نے اپنے سکہ کی قیمت کم کی کیونکہ کوریا کی جنگ کے چھڑ جانے کی وجہ سے اسے اپنی اشیاء دوسرے ملکوں میں بیچنے کا کافی موقعہ مل گیا۔ بہرحال اسباب جو کچھ بھی رہے ہوں، اب تجارتی نقطۂ نظر سے پاکستان و ہندوستان دونوں کو پھر مل جانے کا موقعہ مل گیا ہے، جو دونوں ملکوں کے تعلقات کو خوشگوار بنانے میں بڑی حد تک معاون ہوگا۔ اور ہو سکتا ہے کہ آئندہ ہندوستان اپنے سکہ کی قیمت کو بڑھا کر پھر اپنی اصلی حالت پر لے آئے۔ ابھی تک لین دین کی وہ صورتیں پیدا نہیں ہوئیں جو اس سے قبل پائی جاتی تھیں، خاص خاص تاجروں اور بنکوں کو اس کی اجازت ملی ہے، لیکن امید کی جاتی ہے کہ بہت جلد ہندوستان و پاکستان کے درمیان ترسیل زر کی وہی صورتیں پیدا ہو جائیں گی جو ڈیڑھ سال قبل پائی جاتی تھیں اور عوام اس سے فائدہ اٹھا سکیں گے۔

---


## نگار کے پرانے فائل

۳۹ء۔ ۴۲ء۔ ۴۳ء۔ ۴۴ء۔ ۴۶ء۔ ۴۷ء۔ ۴۸ء۔ ۴۹ء اور ۵۰ء کے مکمل فائل

قیمت فی مکمل فائل معہ محصول دس روپیہ۔ جولائی تا دسمبر ۳۲ء، قیمت معہ محصول پانچ روپیہ۔

منیجر نگار لکھنؤ

# ترقی پسند تحریک

'ترقی پسند تحریک' کے ماننے والوں کے درمیان ایک طرح کا نظریاتی اختلاف ہے، کچھ لوگ ایسے ہیں جو جذباتی زیادہ ہیں۔ انکا نقطۂ نظر غیر متوازن ہے۔ کچھ لوگ ذہنی انتشار کا شکار ہیں اور وہ نہیں جانتے کہ کیا کہیں اور کیسے کہیں۔ کچھ لوگ سنجیدہ اور متوازن ذہن بھی رکھتے ہیں۔ ان متوازن اور سنجیدہ لوگوں میں بھی کچھ زرا زیادہ معتدل ہیں اور باقی کم۔ کارل مارکس کا خیال ہے کہ مادی زندگی کا طریقۂ پیداوار ہی سماجی، سیاسی اور ذہنی شعبہ ہائے حیات کا تعین کرتا ہے۔ سماجی بقا سے ہم انسانی شعور کا پتہ لگا سکتے ہیں۔ مارکس کہتا ہے کہ فن کی پیدائش میں LABOR کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ انسان سماج سے الگ رہ کر اپنی شخصیت کی تعمیر نہیں کر سکتا۔ فنکار کو چاہئے کہ وہ اپنی روزی کمائے تاکہ وہ زندہ رہ سکے۔ بات یہ ہے کہ مارکس تلاش معاش کو تمام انسانی جبلتوں میں اہم ترین جبلت قرار دیتا ہے۔ دوسری جبلتیں ثانوی حیثیت رکھتی ہیں اور وہ اس اولین جبلت سے اثر قبول کرتی ہیں۔ یہی وہ کسوٹی ہے جس پر مارکس ادب اور فن، ادیب اور فنکار کو پرکھتا ہے — جب وہ BYRON اور SHELLEY کا تجزیہ کرنے لگتا ہے تو کہتا ہے کہ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ BYRON چھتیسویں سال مر گیا کیونکہ اگر وہ زندہ رہتا تو ایک رجعت پرست بورژوا ہوتا۔ ساتھ ہی ساتھ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ SHELLEY اُنتیسویں برس میں کوچ کر گیا کیونکہ وہ مکمل انقلاب پسند تھا اور وہ اشتراکی محاذ کا ایک سپاہی ہوتا۔ فریڈرک انگلز بھی کم و بیش انھیں خیالات کا حامی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ BALZAC "شاہیت از روئے قانون" کا حامی ہے پھر بھی اسے ایک بڑا ادیب اس لئے سمجھتا ہے کہ اس کی بہتر تصانیف میں اس زمانہ کے برسر اقتدار سماج کے زوال پر نوحہ خوانی کی گئی ہے۔ اسے وہ حقیقت پسندی کے مترادف سمجھتا ہے اور اسی لئے تعریف کرتا ہے۔ وہ DANTE کی تعریف اس لئے کرتا ہے کہ جاگیردارانہ ازمنۂ وسطیٰ کے زوال کے زمانہ میں وہ جدید دور کا شاعر تھا۔ اسی لئے تقریباً چھ سو برس بعد انگلز اس تمنا کا اظہار کرتا ہے کہ آج بھی جب ایک نئے تاریخی دور کا آغاز ہو رہا ہے کیا اٹلی ایک نیا DANTE دے گی جو اس پرولتاری دور کا پہلا نمائندہ ہو سکے؟ - GOETHE کی عظمت انگلز کے نزدیک صرف اس لئے ہے کہ وہ "خدا" سے نالاں نظر آتا تھا اور اس لفظ سے اسے سکون حاصل نہیں ہوتا تھا وہ انسانی قدروں کا دلدادہ تھا اور اینگلز کے خیال میں یہ خصوصیت اسے شیکسپیر سے بھی اونچا درجہ دیتی ہے۔ LENIN کا خیال ہے کہ TOLSTOY رجعت پسند ہے اور مثالی تصورات پیش کرتا ہے مگر اس کی عظمت کا راز اس حقیقت میں پوشیدہ ہے کہ اس نے اس انقلاب کی عکاسی کی ہے جو ۱۸۹۱ء سے ۱۹۰۵ء تک روس میں ظہور پذیر ہوا۔ اس نے روس کے کسانوں، مزدوروں اور عام آدمیوں کی زندگی ہی سے اپنا خام مواد لیا ہے اور یہی اس کی بڑائی کی دلیل ہے۔ روس کے ایک

موسیقار شوستا کووچ نے عالمگیر امن کانفرنس منعقدہ نیویارک میں یہ اعلان کیا کہ "ہم آرٹ کے میدان میں کام کرنے والے تاریخ کے اس لمحے میں جہد زندگی سے الگ ہو کر اپنے کو اس فریب میں مبتلا نہیں رکھ سکتے کہ ہم زندگی اور اس کی کشمکش سے بالاتر ہیں۔ ہمیں زندگی کے دھارے میں کود کر اس کا رخ بدلنے کی کوشش کرنا چاہئے۔ ہمیں امن کے مجاہدوں کی صف اول میں رہنا چاہئے"۔ اور لوئی آراگاں نے حکم دیا کہ "تھوڑی دیر کے لئے مختلف نغموں کی پرشور موسیقی بند کر دو کیونکہ اس وقت ایسا زمانہ ہے کہ جو غریب لوگ ہیں وہ لغت کی چھان بین میں سرگرداں نہیں رہ سکتے وہ معمولی الفاظ چاہتے ہیں جنہیں سوچتے وقت وہ آہستہ آہستہ دہرا سکیں"۔ یہاں جذباتیت غالب ہے۔ کامریڈ ماؤزے تنگ اعتدال سے کام لیتے ہوئے کہتے ہیں "ہمیں جس چیز کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ سیاست اور آرٹ یعنی فن اور خیال میں اتحاد اور ہم آہنگی پیدا ہو۔ ہم اس رجحان کے مخالف ہیں کہ سارا زور خیال پر صرف کر دیا جائے اور فن کو بالکل نظر انداز کر دیا جائے اور اس طرح ادب اور آرٹ کو سیاسی اشتہار بنا دیا جائے"۔ روسی ادب کا جد امجد PUSHKIN رجعت پرست یا زوال پرست ان اور ہیول کو سمجھتا ہے جو برائی کو ہمیشہ اور ہر جگہ کامیاب و کامراں دکھانا پسند کرتے ہیں اور انسانی دل میں انھیں صرف دو تار دکھائی دیتے ہیں۔ انا اور تکبر کے تار۔ جدید ترقی پسند نقاد RALPH کو یہ یقین ہے کہ انقلابی وہ ہے جو ماضی کی میراث میں سے زندگی بخش اور امید افزا اجزا کو اخذ کر لیتا ہے اور حال کی کسی ایسی شے کو درگزر نہیں کرتا جس سے ہم مستقبل کی تعمیر میں کسی کام میں لا سکیں۔ اردو میں ترقی پسند نظریات کی وضاحت سب سے پہلے سجاد ظہیر، احمد علی، اختر حسین رائپوری، مجنوں گورکھپوری، عزیز احمد وغیرہ نے کی۔ اختر حسین رائے پوری کہتے ہیں "سماج کی بنیاد افراد کے اقتصادی تعلقات پر منحصر ہے اور ان کے رشتہ مادی کے اعتبار ہی سے کسی دور کی ذہنی و روحانی تحریکات کو سمجھا جا سکتا ہے۔ علاوہ بریں ادب اب تک تعلیم یافتہ طبقے کا اجارہ رہا ہے اور اس کی گہرائیوں تک پہونچنے کے لئے اس طبقے کے رجحانات کو پہچاننا بے حد ضروری ہے"۔ اسی بنا پر اختر حسین رائے پوری، ٹیگور کو رجعت پرست اور اقبال کو فاسسٹ بتاتے ہیں اور قدیم و جدید ادوار کے ہندستانی ادب کا صرف "معاشی" تجزیہ کرتے ہیں۔ مجنوں گورکھپوری ترقی پسند ادب اور فطری ادب میں فرق نہیں سمجھتے۔ انکا خیال ہے کہ "ترقی پسند ادب کی بنیاد واقعیت اور جمہوریت پر ہوتی ہے اور وہ ماضی کا معترف ہوتا ہے لیکن وہ مستقبل اور اس کے لامحدود امکانات پر صدق دل سے ایمان رکھتا ہے"۔ ان سب کا لب لباب یہ ہے کہ انسان کی سب سے بڑی ضرورت روٹی ہے اور یہ کہ مادی زندگی میں پیداوار کے طریقے اجتماعی، سیاسی اور ذہنی زندگی کے رجحانات کی تلقین کرتے ہیں ان کے یہاں افادیت میں حسن ہے اور بغیر افادیت کے حسن کا تصور ناممکن ہے۔ وہ فن کے سماجی پہلو کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ اور اگر ادب میں سماج کے ہر پہلو پر نظر نہ رکھی گئی تو وہ صالح ادب نہیں ہو سکتا۔ سماج کو یہ حصوں میں تقسیم کر دینے کے قابل نہیں اس کی اکائی پر ایمان رکھنے والے ہیں۔ یہ نظریے بے شمار انتہا پسندی پر مبنی تھے اور ردعمل کے طور پر پیدا ہوئے تھے۔ ایک گروہ اور ہے جو ذرا دھیما ہے اور جذباتیت پر قدرے غالب ہے مگر بدقسمتی سے اسے سرکاری انجمن کی منظوری اور تائید حاصل نہیں۔ پریم چند ادب کی وضاحت یوں کرتے ہیں "ادب اس تحریر کو کہتے ہیں جس میں حقیقت کا اظہار ہو۔ جس کی زبان شستہ، پختہ اور لطیف ہو جس میں دل اور دماغ پر اثر ڈالنے کی صفت ہو اور ادب میں یہ صفت کامل طور پر اسی حالت میں پیدا ہوتی ہے جب اس میں زندگی کی حقیقتیں اور تجربے بیان کئے گئے ہیں"۔ احمد علی انھیں خیالات کو دہراتے ہیں "یہ

بھولنا چاہئے کہ ادب صرف اس وقت ہی زندہ رہ سکتا ہے جب کہ وہ بصرف سماجی احساس کو صداقت اور صدق دلی سے ظاہر کرے بلکہ وہ بحیثیت ادب کے بھی عمدہ اور بلند پایہ ہو۔" فیض احمد فیض زیادہ سلجھے ہوئے انداز میں سمجھاتے ہیں "ترقی پسند ادب سے ایسی تحریریں مراد ہیں جو سماجی ترقی میں مدد دیں اور ادب کے فنی معیار پر پوری اتریں۔" وہ شاعری کا مقصد تنقید و تفسیر حیات ہی کو جانتے ہیں مگر اس انداز سے کہ پڑھنے والے کو نشاط دل و دماغ حاصل ہو۔ عزیز احمد نے ترقی پسند ادب سے تفصیلی بحث کرتے ہوئے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ترقی پسند تحریک دو عناصر سے ملکر بنی ہے۔ حقیقت نگاری اور انقلابی تحریک۔ ان کا یہ بھی ایمان ہے کہ انسان کا ہزارہا سال کا وجدانی تجربہ محض دھوکا نہیں ہو سکتا۔ اور وہ پیشین گوئی کرتے ہیں کہ اشتراکی ملک کا رہنے والا انسان بھی جب تمام معاشی مسئلے حل کر چکے گا تو وہ ایک باطنی اندرونی خلا محسوس کرے گا جس کے لئے وجدانی احساس کی ضرورت ہوگی۔ باقی کچھ لوگ اور بھی ہیں جو جہاں تک اصولی بحثوں کا تعلق ہے ایک غیر جذباتی اور متوازن اصول کا پرچار کرتے ہیں۔ وہ جذباتی نہیں اور توازن کا احساس ان میں موجود ہے۔

Ivor Brown نے اپنی کتاب لٹریچر اینڈ ریوولیوشن (ادب اور انقلاب) میں ایک جگہ ادب اور سماج کے فرائض پر روشنی ڈالی ہے، اس نے فن اور پروپیگنڈا کے فرق کو بتلایا ہے اور یہ بتایا ہے کہ فنکار اگر ایک مقصد پر ایمان رکھتا ہے تو اس مقصد کا اظہار اس کی تخلیقات میں ہو بہو ہو براہ راست اس طور پر نہ ہونا چاہئے جس طور پر وہ اس عقیدے کا حامل ہے۔ بلکہ اسے چاہئے کہ جس طرح وہ اس عقیدہ کو محسوس کرتا ہے اسی احساس کی عکاسی اور جھلک اس کے فن میں موجود ہو جہاں تک کہ اس کے مواد میں اس کے عناصر پائے جانے کا سوال ہے۔ کرسٹوفر کاڈویل، جو جدید ترقی پسند ادیب ہے، نے اپنی کتاب "الیوژن اینڈ ریلیٹی (سراب اور حقیقت) میں اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ "جب ہم جدید کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو عام طور پر اس میں وہ تمام ثقافتی پیچیدگیاں مضمر ہوتی ہیں جو پندرھویں صدی کے بعد سے یوروپ و بیرون یوروپ میں پھیل رہی ہیں۔ ہنری تھیلس، جیمس، بیوولف کے مقابلہ میں شیکسپیر میکائیل انجلو، پوپ، گیٹے اور والیٹر زیادہ جدید ہیں اور ان سے بھی زیادہ جدید ویلیری، سیزان، جیمس جوائس، برگساں اور آئنسٹائن ہیں۔ اس پیچیدگی کا دارومدار معاشیات پر ہے۔" پھر آگے چل کر وہ فن کے متعلق یوں رقمطراز ہے۔ "ہمارا مطالبہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ تمہارا فن پرولتاری ہونا چاہئے تو اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ تم فن میں اپنے عقاید اور مارکسی محاورات کا استعمال کرو۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ تم واقعتاً اس نئی دنیا میں سانس لو اور ماضی میں اپنی روح نہ چھوڑ رکھو۔ ماضی کو حال میں کھینچ لاؤ اور مستقبل کا احساس رکھو تم صرف ایک فنکار نہیں بلکہ پرولتاری فنکار ہو جاؤ گے۔ کم و بیش کاڈویل ہی کے خیالات کا اظہار اردو میں ترقی پسند نقاد احتشام حسین نے بھی کیا ہے "ادب میں ترقی پسندی زندگی میں ترقی پسندی سے الگ کوئی چیز نہیں۔ ہر ترقی پسند کے سامنے ایک مخصوص فلسفۂ حیات ہے جس سے زندگی کے ہر شعبہ میں حرکت اور تغیر کو سمجھا جا سکتا ہے۔" ترقی پسند ادیب ادب کو مقصود بالذات نہیں سمجھتا بلکہ زندگی کی ان کشمکشوں کی توجیہ، تشریح اور اظہار کا آلہ سمجھتا ہے جن سے زندگی کی نشوونما ہوتی ہے اور اسے ان مقاصد کے حاصل کرنے کا ذریعہ بنانا چاہتا ہے جن سے آزادی امن اور ترقی عبارت ہے۔ وہ جمہوریت کا خواہاں ہوتا ہے۔ وہ کلچر کو چند انسانوں کی ملک بنانے کے بجائے تمام انسانوں کی چیز بنا دینا چاہتا ہے جو آزادی کی تحریک کو آگے بڑھانا چاہتے ہیں اور اتحاد دشمن طاقتوں سے برسرپیکار ہیں۔" "ترقی پسند ادب کا زاویۂ نظر مواد اور ہیئت کے

تعلق کے بارے میں بہت واضح ہے۔ وہ تمام شعراء اور نقاد جو زندگی کو تمامیاتی مانتے ہیں۔ جو خصوصیتوں سے مقدار کو اور مقدار سے خصوصیتوں کو بدلنے کے قایل ہیں، جو شاعری کو زندگی کا مظہر مانتے ہیں، جو ادب کو سماجی ترقی کا ایک آلہ سمجھتے ہیں اور جو تمدن کو عام کرنا اور فنون لطیفہ کو عوام کی چیز بنانا چاہتے ہیں وہ کسی حالت میں بھی ہیئت اور اسلوب کو مواد پر اہمیت دینے کے لئے آمادہ نہیں ہو سکتے۔ ترقی پسند شاعروں کا خیال ہے کہ دنیا کو ترقی کی راہ دکھانے میں ادب کا بھی ہاتھ ہے اور یہ رہنمائی ہیئت سے نہیں صحت بخش خیال ہی سے ہو سکتی ہے"۔ "ہیئت اور اظہار کی بھی ایک سماجی حیثیت ہے کیونکہ وہ ادیب اور پڑھنے والے کے درمیان ایک رابطہ کی حیثیت رکھتی ہے"۔ "ترقی پسند قدیم ادب کے سرمایہ کو آگ لگا کر ختم نہیں کر دینا چاہتا کیونکہ اس سے زیادہ کوئی اس کا قایل نہیں ہے کہ ایک تہذیب و تمدن کا دور اپنے گزشتہ تہذیب و تمدن کے دور سے روشنی لیکر آگے بڑھتا ہے چاہے وہ مد و اثبات میں ہو یا نفی میں۔

میں نے ترقی پسند تحریک کے حامیوں کے نظریات بیان کرنے کے سلسلہ میں انھیں مختلف گروہوں میں تقسیم کیا تھا۔ اسی طور پر ان لوگوں کو بھی چند گروہوں میں بانٹ سکتے ہیں جو ترقی پسند تحریک سے متعلق نہیں ہیں، مگر جنھوں نے اس تحریک اور اس کے ادب کے بارے میں اپنے ذاتی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ایک گروہ ان لوگوں کا ہے جو شروع شروع اس تحریک میں خاص دلچسپی لے رہے تھے مگر بعد میں انھوں نے چند شکوک کا اظہار کیا اور تحریک کے کارناموں کے غیر تشفی بخش ہونے پر رائے زنی کی ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا عبدالحق اور احمد علی ان لوگوں میں سے چند ہیں۔ احمد علی تو اس تحریک کے بانیوں میں شمار کئے جا سکتے ہیں اور پنڈت نہرو اور مولانا عبدالحق ابتدائی دور کے ہمدردوں میں۔ پنڈت نہرو اپنی جھجک کا اظہار یوں کرتے ہیں "ایک بات سے میں جھجکتا ہوں وہ یہ ہے کہ ایسا ادب لکھتے وقت اکثر لوگ خاص خاص فقرے خاص خاص نعرے دہرانے لگتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس طرح انھوں نے ایک زبردست خیال رکھ دیا۔ لیکن معقول لکھنے والے کے لئے یہ زیبا نہیں اور نہ اس میں آرٹ ہے اور نہ کوئی خاص بات اور نہ کوئی خاص پیغام۔ ایسی چیزوں کی جگہ سیاست میں ہے"۔ عبدالحق بھی ان نوجوانوں کے ادب سے مطمئن نہیں، "معاف فرمایئے گا۔ میں دیکھتا ہوں کہ اکثر ترقی پسند نوجوان اپنے خیالات کو صحیح طور پر ادا کرنے سے قاصر رہتے ہیں جو دل میں ہے وہ بیان میں نہیں آتا۔ ممکن ہے کہ وہ یہ جواب دیں کہ ہمارے خیالات اس قدر اعلیٰ ہیں کہ عام فہم سے بالاتر ہیں۔ میں اسے تسلیم نہیں کرتا۔ اور غالباً کوئی بھی اسے تسلیم نہیں کرے گا۔ زبان کیا ہے؟ خیال کے ادا کرنے کا آلہ۔ یہ کہنا صحیح نہیں کہ ہماری زبان میں ہمارے خیالات نہیں سما سکتے لکھنے والوں میں کم ایسے ہیں جو الفاظ کے صحیح استعمال سے واقف ہیں۔ لفظ ایک بڑی قوت ہے اور اس کا برمحل استعمال خیال میں قوت پیدا کرتا ہے جو اس گر سے واقف نہیں اور لفظ کے صحیح اور برمحل استعمال کو نہیں جانتا، اس کا بیان اکثر ناقص، ادھورا اور بے جان ہوتا ہے"۔ احمد علی انھیں حقیقتوں کی روشنی میں ادب کی وضاحت یوں کرتے ہیں "ادب جان بوجھ کر پروپگنڈا نہیں کرتا۔ کم از کم اچھے ادب کو جان بوجھ کر پروپگنڈا نہیں کرنا چاہئے۔ میں اس کو ادب ماننے کے لئے طیار نہیں ہوں جو ایک سیاسی لیڈر کی طرح کھڑا ہو کر دیوانہ وار چیخے کہ لوگو تم ننگے ہو تم پر ظلم ہو رہے ہیں اس لئے تم انقلاب کرو۔ میں مصنف ہوں، میں پروپگنڈسٹ نہیں ہوں۔ میں سوسائٹی کی نبض دیکھتا ہوں لیکن میں ایک اناڑی طبیب کی طرح جو سڑک کے کنارے کھڑا ہو کر ایک ہی دوا سے سب مریضوں کا علاج کر دیتا ہے، پروپگنڈا کی گولی اس کو دینے کے لئے طیار نہیں ہوں۔ میں حقیقت نگاری کو نہیں بھولتا لیکن میں ہیوقوفی کی حرکت کو غیر ادیبانہ تصور کرتا ہوں"۔ یہ جملے اس ردِ عمل

کے طور پر لکھے گئے ہیں جو اس تحریک کی اولین تخلیقات کو دیکھ کر پیدا ہوا ہے - دوسرا گروہ بھی ان لوگوں کا ہے جو اس تحریک کو بہ نظر احسن دیکھتے تھے یا دیکھتے ہیں مگر چند بے ضابطگیوں سے نالاں ہیں - رشید احمد صدیقی، ممتاز شیریں اور آل احمد سرور کا نام اس سلسلہ میں لیا جا سکتا ہے رشید صدیقی چند بے لاگ باتیں عام مفروضات کے طور پر بیان کر جاتے ہیں " ادب سنت الدین نہیں ہے کہ اس میں تبدیلی ناممکن ہو شعر و ادب انسانوں کی بنائی ہوئی چیز ہے اور انسانوں کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ اپنی ضرورت کے مطابق اسے ڈھالتے رہیں - ترقی پسند ادب کو محض اصلاح بن کر نہ رہنا چاہئے - اس کو واعظین کی تنگنائے سے نکل کر زندگی کی وسعتوں پر محیط ہونا چاہئے - ذہنی دنیا میں رہنا یا داخلی شاعری کی آڑ پکڑنا میرے نزدیک یکسر مہمل ہے - اگر شاعر اپنے آپ کو خارج سے بے نیاز کر لے اور خارج کو توڑنے مروڑنے اور سلجھانے سنوارنے میں خون پسینہ ایک نہ کر دے یا نہ کر سکے " پھر رشید احمد صدیقی اس تحریک کے پیدا کردہ ادب کے چند عنوانات سے بحث کرتے ہیں جو اس سے مخصوص ہیں اور ادیبوں کو ان موضوعات کی تنگنائے سے نکل کر زندگی کے بحر بیکراں کے موضوعات میں غوطہ زن ہونے کی دعوت دیتے ہیں - سردار اس تحریک کے اعلیٰ مقاصد کو سراہتے ہیں - اس کے ادب کے ایک حصہ کو بھی وہ بیش قیمت گردانتے ہیں، مگر سب سے پہلے تو وہ اس کے پیروؤں ہی سے مطمئن نظر نہیں آتے، ہر تحریک اپنے پیروؤں سے پہچانی جاتی ہے - " یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ اس تحریک کو چلانے والوں میں مبلغ نقیب، نعرہ لگانے والے بہت ہیں - ایسے لوگ کم ہیں جو پروپگنڈے اور آرٹ کے فرق کو جانتے ہوں - اس تحریک کے بعض علمبرداروں میں بڑی سطحیت، بڑی رعونت، بڑی تنگ نظری، بڑی قطعیت ہے - یہ زندگی کو مارکسی فارمولوں اور اقتصادی اصولوں کے سوا کچھ نہیں سمجھتے یہ اب سے دس سال پہلے جو کچھ لکھا گیا ہے اسے حرف غلط کی طرح مٹانا چاہتے ہیں - اور یہ ایک اچھے ادیب کے منصب کے خلاف ہے - یہ ایک ذہنی غلامی سے نکال کر دوسری ذہنی غلامی میں انسان کو مبتلا کرنا چاہتے ہیں - یہ فن سے ناواقفیت کو آرٹ سمجھتے ہیں اور طوائف کو ہیروین - یہ مذہب اخلاق اور تہذیب کو آثار قدیمہ کہتے ہیں اور مارکس کو انسانیت کا حرف آخر " یہی سبب ہے کہ اس تحریک کو دیوپیکر اشخاص نصیب نہ ہو سکے جو علی گڑھ تحریک کو نصیب ہوئے یہی وجہ ہے کہ یہ ادب ابدیت کم رکھتا ہے اور اس کے نغموں کی شیرینی کچھ عرصے کے بعد پھیکی معلوم ہونے لگتی ہے - اس کے پاس جذبات ہیں ذہن نہیں ہے - گرمی ہے - روشنی نہیں ہے، دل ہے دماغ نہیں ہے " ممتاز شیریں کے گلے اور شکایتیں بھی ان حضرات سے ملی جلی سی ہیں - ان تمام حضرات کے خیالات میں خلوص ہے، سچائی ہے اور ایمانداری ہے - ان کے اعتراضات تعمیری ہیں - انھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا - ممتاز شیریں تحریک کے علمبرداروں کے احتسابی عمل سے نالاں ہیں، " مصیبت تو یہ ہے کہ ایک خاص قسم کے احتساب کے حق میں اور ذہنی آزادی کے خلاف جو دلیلیں پیش کی جاتی ہیں ان میں سرے سے یہ سمجھا ہی نہیں جاتا کہ ادب کیا ہے اور کیسے پیدا ہوتا ہے - وہ ادیب کو ایک طرف یا تو صرف تفریح نگار سمجھتے ہیں یا دوسری طرف محض پروپگنڈسٹ جو کسی سیاسی پارٹی کی ہر آن بدلتی ہوئی پالیسی کے مطابق اپنی تحریریں بدل سکے، جبراً ادب پیدا نہیں کر سکتا - جب تک ادیب بے ساختگی سے آزادی سے نہیں لکھتا ادبی تخلیق ناممکن ہے - ادیب کو مجبور نہیں کیا جا سکتا - اس پر سیاسی قوانین نافذ کرنا سیاسی مقصد کے لئے اس کی تخلیق کا گلا گھونٹنا ہے " کلیم الدین احمد سختی سے ترقی پسند تحریک کے اصولوں اور ان کے ادب کا جایزہ لیتے ہیں - وہ ان سے بالکل خوش نہیں نظر آتے - ان کا خیال ہے کہ اس تحریک کا پیدا کیا ہوا ادب مطلق تشفی بخش نہیں - اس ادب کی اہم کمی یہ ہے کہ اس میں ادبی محاسن کا

فقدان ہے۔ "ترقی پسند مصنفین" ادب سے ناجائز کام لیتے ہیں اس لئے وہ اور جو کچھ بھی ہوں ادیب کی حیثیت سے زندہ نہیں رہ سکتے ان کی تحریروں میں اشتراکی پہلو ادبی پہلو پر غالب ہوتا ہے وہ غور و فکر سے کام نہیں لیتے اور خیالات بالکل اخذ کر لیتے ہیں۔ طرز ادا بھی ناقص ہے۔ یہی اسباب ہیں کلیم الدین احمد کی خفگی کے۔ علاوہ بریں کلیم ان مفروضات سے بھی مطمئن نہیں جن پر اس تحریک کی بنیاد ہے۔ "پہلی بات تو یہ ہے کہ جن مفروضوں پر وہ اپنی دلیل کی بنیاد قایم کرتے ہیں ان کی صحت میں بہت کچھ بحث کی گنجایش ہے پھر ان مفروضوں کی بنا پر جو نتائج وہ اخذ کرتے ہیں وہ نتائج مستنبط نہیں ہوتے، لیکن سب سے اہم نقص یہ ہے کہ وہ مبہم و غیر متعین الفاظ استعمال کرتے ہیں اور ان سے ناجائز مصرف لیتے ہیں"۔ پھر کلیم ان اصولوں کے عمارت کی سنگ بنیاد پر ایک ضرب کاری لگاتے ہوئے کہتے ہیں "انسان کی سب سے بڑی ضرورت روٹی نہیں انسان کی سب سے بڑی اہم، قیمتی ضرورت دماغی خواہشات کی تسکین اور دماغی قوتوں کی ترقی ہے"۔ ایک اور گروہ بھی ایسا ہے جو شد و مد کے ساتھ ترقی پسند تحریک پر معترض ہے اور 'ترقی پسند مصنفین' کی دھجیاں اڑاتا رہتا ہے ان میں حسن عسکری پیش پیش ہیں۔ وہ کہتے ہیں "ترقی پسند لفظ بہ لفظ سیموئل بٹلر کے پیوریٹن عالم دین کی طرح ہیں"۔ حسن عسکری کا خیال ہے کہ فنکار کی حقیقت سیاسی یا معاشی حقیقت سے بالکل مختلف چیز ہے۔ اس کے لئے تو حسیاتی حقیقت سب سے بڑی حقیقت ہے اور اس سے الگ رہ کر وہ فنکار نہیں رہتا۔ "فنکار کے لئے اپنے زمانہ کے مروجہ سیاسی نظریوں اور اس قبیل کی دوسری نظریاتی چیزوں کو اس طرح "سمجھنا" بالکل ضروری نہیں جس طرح سیاسی لیڈر یا اسمبلی کے لئے ووٹ دینے والوں کو یہ باتیں سمجھنی چاہئیں"۔ حسن عسکری سمجھتے ہیں کہ "ہیئت ہی کل آرٹ ہے اور ہیئت ہی فنکار کی حقیقت ہے۔ ہیئت کی تلاش ایک اخلاقی جدوجہد ہے، بلکہ خود زندگی کی تلاش ہے"۔ اسی سلسلہ میں دو مغربی نقاد ایچ۔ اے میسن اور مڈلٹن مری کا حوالہ دینا بیجا نہ ہوگا۔ وہ بھی اس تحریک سے متفق نہیں اور اصولی اختلاف رکھتے ہیں۔ میسن کہتا ہے "جب مارکس کے پیرو ادب کا ذکر کرتے ہیں تو ان کی باتوں میں ایک عجیب باسی پن ہوتا ہے۔ پختگی کا تو ذکر ہی کیا"۔ کاڈویل کی کتاب کے بارے میں اس کا خیال ہے کہ "اس کتاب کو پڑھا نہیں جا سکتا۔ اس میں جو کچھ کہا گیا ہے زیادہ تر اس کا اصلی بحث سے کوئی تعلق نہیں۔ اس نے صرف میکانکی طور پر مارکسی فلسفے کو ادب پر عاید کرنے کی کوشش کی ہے اور الٹی سیدھی مارکسی اصطلاحوں کی بھرمار کر دی ہے۔ یہ ساری باتیں پوری کتاب کے بجائے چھوٹے سے پمفلٹ میں کہی جا سکتی تھیں"۔ مڈلٹن مرے بھی اسی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں "اس کتاب میں بڑا جوش ہے، بڑا جذبہ ہے، بڑی نیک دلی ہے۔ کاڈویل ایک قسم کا جدید شیلی ہے اور مارکس اس کا گوڈون ہے۔ شیلی ہی کی طرح وہ کوئی اچھا لکھنے والا نہیں۔ وہ گھسی پٹی باتیں کہتا ہے۔ یہ اس خوش یقینی اور اندھے اعتقاد کا اظہار ہے جو کمیونزم کی آخری شکل ہے۔ دراصل مارکسیوں کا پرولتاریہ محض ایک مجرد شکل ہے محض ایک مفروضہ کاڈویل نے پرولتاری آرٹ کے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ سرتاپا حماقت ہے اس کتاب کی اصلی دلچسپی اس بات میں ہے کہ یہ ایک مخلص مارکسی کی ناکامیابی کی بڑی اچھی مثال ہے"۔ یوں تو اس تحریک اور اس کے مصنفین کے خلاف بہت کچھ کیا گیا ہے، مگر زیادہ تر اعتراضات انتہا پسندی کی مثالیں ہیں اسی لئے میں نے چند سنجیدہ اور مقتدر اور مخلص ادیبوں کی رائیں نقل کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ جو جذباتی یا ردعمل کے طور پر اس تحریک پر معترض ہیں ان کا حوالہ دینا میں نے قطعی نامناسب خیال کیا ہے۔ اب انھیں بیانات کی روشنی میں "ترقی پسند ادب" کا

ایک سرسری جایزہ لینا بیجا نہ ہوگا۔

ترقی پسند ادب کو ہم یوں ہی تین ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ترقی پسند مصنفین کے قیام کے بعد کے پانچ سال، اس کے بعد کے پانچ سال اور پھر گزشتہ پانچ سال۔ یہ تقسیم سو فیصدی درست نہ ہوگی مگر پھر بھی ان ادوار کی الگ الگ اپنی خصوصیات ہیں۔ پہلا دور عام طور پر ہیجان، ردعمل، جھلاہٹ اور چڑچڑے پن کا دور ہے۔ جذباتیت ہر جگہ غالب ہے۔ مطالعہ کی خامکاری نمایاں ہے۔ خیالات میں وسعت کی بجائے تنگی ہے۔ ابہام اور اشاریت (نامحوشگوار حد تک) اور پھر جنسی کجروی ——— یہ تو کہا جا چکا ہے کہ اس تحریک کا پہلا اہم کارنامہ "انگارے" کی اشاعت ہے اور انگارے کی خصوصیات بھی بتلائی جا چکی ہیں، بس یہی ساری خصوصیات کم و بیش اس دور کی تمام تخلیقات پر صادق آتی ہیں۔ احمد علی کی "شعلے"، سجاد ظہیر کا ڈرامہ "بیمار" اور ناولٹ "لندن کی ایک رات"، علی سردار جعفری کی "منزل"۔ حیات اللہ انصاری کی "انوکھی مصیبت"، اختر رائے پوری کی "محبت اور نفرت" اور رشید جہاں کی "عورت" سبھوں کا تقریباً یہی حال رہا۔ تمنائی نے چین کی کہانیوں کا ترجمہ "زندہ چین" کے نام سے شایع کرایا۔ ترجمہ بھی کامیاب نہ ہو سکا۔ تمام مجموعوں میں فنی خامیوں کا پتہ ملتا ہے۔ فارم کا احساس تو گویا کسی کو بھی نہیں۔ منتشر تاثرات بکھرے پڑے ہیں اور بس ———

——— یوں کہنے کو تو اس وقت پریم چند بھی لکھ رہے تھے اور پریم چند گویا اردو افسانہ نگاری کے باوا آدم اور حقیقت طرازی کے پیغمبر اولی ہیں مگر کیا ہم پریم چند کو صرف اس لئے اس تحریک سے منسلک کر دیں کہ تحریک کے قیام کے بعد ایک سال تک وہ زندہ رہے؟ ——— پریم چند کی تخلیقات پر اس تحریک کا کیا اثر پڑ سکتا تھا۔ ہاں وہ اس انجمن میں شامل ضرور ہوئے تھے اور اس کے مقاصد سے ہمدردی ضرور رکھتے تھے مگر ان کے افسانوں (کفن وغیرہ) کو انجمن کے اس دور کی ادبی تخلیق میں گنوانا پریم چند کی پچھلی زندگی کی تخلیقات کو یکسر نظر انداز کر دینے کے مترادف ہوگا۔ یوں تو جوش، فراق، ساغر، قاضی عبدالغفار، مجنوں گورکھپوری، ل۔ احمد، ڈاکٹر تاثیر وغیرہ بھی ان لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے انجمن کے ابتدائی دور میں انجمن کا ساتھ دیا اور ان کی تخلیقات بھی ترقی پسند تخلیقات میں گنی جاتی ہیں مگر تعجب تو یہ ہے کہ اس دور کے بزرگوں کی تخلیقات نوجوانوں سے بدرجہا بہتر ہیں۔ اور یہ لوگ تو ان لوگوں میں سے ہیں جو انجمن کے قیام کے قبل ہی سے لکھ رہے تھے۔ اس وقت کے نوجوان ادب کے ہر اس ٹکڑے کو بیکار، لغو اور لایعنی تصور کر رہے تھے جو اُنسے قبل لکھا گیا۔ اسے پرانا، فرسودہ اور رجعت پسند ادب کہا جانے لگا تھا اور ہر وہ افسانہ یا شعر یا جملہ ترقی پسند کہا جانے لگا جو اس تحریک کے کسی رکن نے لکھ مارا ——— "آزادی کی نظمیں" کے عنوان سے جو مجموعہ اس دور میں شایع ہوا اس کی بھی یہی خصوصیات ہیں۔ پھر دوسرا دور آتا ہے۔ یہ دور فن میں پختگی، تبلیغ میں توازن، فارم میں تجربے، مطالعہ میں گہرائی، جذبات میں اعتدال اور ادب میں صحیح ترقی پسندی (حقیقت حد تک) کا دور ہے۔ پہلے دور کا ادب ترقی پسند زیادہ تھا ادب کم تھا۔ دوسرے دور کا ادب ترقی پسند بھی تھا اور ادب بھی۔ آزادئ ملک کے جذبے سے ہر فنکار متوالا تھا اور فاسزم کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کے لئے کمربستہ۔ وہ نت نئے موضوعات ادیبوں اور شاعروں کو دے رہا تھا اور فارم میں ہر روز نیا تجربہ ہو رہا تھا۔ یہ مانا کہ سارے تجربے کامیابی کے نمونے نہیں اور سارے موضوعات دنیا کے سلگتے موضوعات کے مقابلہ میں صرف ایک مخصوص زاویۂ حیات کے موضوعات ہیں پھر بھی وہ اُردو ادب میں اضافہ کی حیثیت ضرور رکھتے ہیں۔

نے لکھنے والوں میں اچھے فنکار ابھر رہے ہیں اور ان کی تخلیقات کا ایک حصہ یقینی ایسا ہے جو قابل اعتنا ہے۔ جوش اور احسان دانش کے کئی مجموعے، پھر فیض کا "نقش فریادی" راشد کا "ماورا"۔ مجاز کا "آہنگ" احمد ندیم کی "دھڑکنیں" جاں نثار اختر کی "سلاسل" اختر الایمان کا "گرداب" ایسے مجموعے ہیں جو کام کے ہیں ـــــ اور اردو ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پھر مختار صدیقی، اختر شیرانی، شاد عارفی، یوسف ظفر، جذبی، اختر انصاری، مطلبی، مخدوم، تاثیر، میراجی، سلام، مخمور جالندھری، کیفی ان لوگوں میں سے ہیں جو اس وقت سے آج تک کوشش کئے جا رہے ہیں۔ ان میں سے کچھ ابہام اور جنسی کجروی کے لئے مشہور ہیں اور کچھ اپنی یاسیت کے لئے اور کچھ اپنے ڈھنڈورچی پن کے لئے مگر باقی ایسے ہیں جو کوشاں ہیں اور ترقی کی راہ پر گامزن ہیں۔ فیض کی "بول" اور مخدوم محی الدین کی "یہ جنگ ہے یا جنگ آزادی" اس دور کے رجحان کا صاف پتہ دیتی ہیں۔ جوش کی "فرزندان ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام" اور "تاجدار برلن کے نام" اس دور کی سراسیمگی، پریشانی، پراگندگی انتشار اور افراتفری کی مظہر ہیں۔ نثر میں کرشن چندر، بیدی، منٹو، عصمت، احمد عباس، سہیل، اختر انصاری، اختر اورینوی، علی عباس حسینی، ممتاز مفتی، احمد ندیم قاسمی، بلونت سنگھ اور رشک کے بیشتر افسانے اردو افسانہ نگاری میں قابل قدر اضافے ہیں۔ مقالہ نگاری میں فیض، احتشام، ڈاکٹر عبدالعلیم، سبط حسن، سجاد ظہیر، تاثیر، عزیز احمد، فراق، مجنوں، اکثر سلجھی ہوئی باتیں کہہ جاتے ہیں اور وہ رجعت اور قطعیت نہیں جو پہلے دور میں اختر رائے پوری، احمد علی اور سجاد ظہیر وغیرہ کی بیشتر تنقیدوں میں ہے۔ تیسرے دور میں انتہا پسندی کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ دور تنقیدوں اور تقریروں کا دور ہے۔ جھلاہٹ اور بوکھلاہٹ کی ملی جلی کیفیت ہر جگہ نمایاں ہے۔ فسانے اور نظمیں مایل بہ زوال ہیں۔ صرف چند فنکاروں کے چند فن پارے ایسے ہیں جو قابل اعتنا ہیں۔ لوگ یا تو انجمن چھوڑ رہے ہیں یا چھوڑنے پر مجبور کئے جا رہے ہیں۔ احمد علی، اختر رائے پوری، عزیز احمد، جوش، ساغر، احمد عباس، اختر اورینوی، سہیل عظیم آبادی، علی عباس حسینی، فیض احمد فیض، بیدی، منٹو، اشک، بلونت سنگھ، جذبی، تاثیر، میراجی، راشد وغیرہ وغیرہ یا تو نکالے جا چکے ہیں یا معتوب ہیں۔ تنقیدی مضامین زیادہ تر لکھے جا رہے ہیں، مگر ان میں شدید اختلافات ہیں۔ احتشام حسین جسے ترقی پسند ادب سمجھتے ہیں وہ کم از کم آج نہیں لکھا جا رہا ہے۔ عبادت بریلوی بیچارے خواہ مخواہ اس تحریک اور اس کے ادب کی شان میں رطب اللسان ہیں۔ نہ معلوم عصمت کی ڈانٹ کے بعد بیچارے کا کیا حال ہے۔ وہ محو فشار کئے جاتے ہیں اور دوزخی کی لکھنے والی یہ کہہ کر ڈانٹے جاتی ہے کہ صاف کیوں نہیں کہتے کہ صرف کمیونسٹ ترقی پسند ہوتا ہے۔ کبھی کبھی ممتاز حسین بھی سلجھی ہوئی باتیں کہہ لیتے ہیں مگر ان کی سنتا کون ہے۔ مختلف ادبی انجمنیں قایم ہو رہی ہیں۔ ان کے سرکاری آرگن بھی ان سے نالاں ہو کر اپنی راہ الگ بنا رہے ہیں آج جو ادب قابل اعتنا ہے وہ ان لوگوں کا ہے جو سرکاری طور پر "CONDEMNED" ہیں۔ احمد ندیم قاسمی "نقوش" کے ایک شمارہ میں اپنی بہت ساری غلطیوں اور انتہا پسندیوں کا اعتراف کرتے ہیں اور دوسرے ہی شمارہ میں عصمت اسی مستقل عنوان کے تحت ان باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے ادبی حکم نافذ کر دیتی ہے، احتشام، عبادت، ممتاز حسین، عصمت، احمد ندیم سبھوں کے زاویۂ نظر میں اختلاف ہی نہیں تضاد ہے، خوب معلوم ہوتا ہے کہ کہیں روسی ادب (جنگ عظیم نمبر ۲ سے قبل) جن ادوار سے گزرا کہیں انہیں ادوار سے اردو ادب بھی تو نہیں گزر رہا پھر تو ادبی ڈھنڈورے بازوں کو اپنے مستقبل سے ہوشیار رہنا چاہئے، وہ فی الحال ایسے طاقتور

بھی نہیں کہ پرولٹ کلٹ یا راپ والوں کی طرح کسی کو دار پر لٹکا دیں، کسی کو ملعون قرار دیدیں اور کسی کو جلا وطنی کی سزا دے ڈالیں روسی ڈراما نگار کے ٹرینف نے اپنی تصنیف BENOTRFRFRAIDTODRRE میں لکھا "اسٹالن گراڈ پر دس سے زاید ڈرامے لکھے گئے مگر ان میں سے ایک بھی قایم نہ رہ سکا، اس کا سبب یہ تھا کہ وہ اچھا مستند ادب نہ تھا وہ کارنامے فنی تھے" ۱۹۳۲ء میں روس کی کمیونسٹ پارٹی نے راپ کا خاتمہ کر دیا۔ اور اس کی شایع کردہ بیس ہزار کتابیں اور ان کے ساتھ راپ کے ۳۰ لاکھ اعلانات نذر آتش کر دئے گئے۔ سرکاری اعلان ہوا کہ اس زمانے (۱۹۱۷ء سے ۱۹۳۲ء تک) کی تصنیفات کا بیشتر حصہ قابل اعتنا نہ تھا پھر ملک کے ادیبوں کو ہدایت کی گئی کہ اشتہار بازی کے بجائے وہ "سوشلسٹ واقعیت" کی طرف رجوع کریں۔ کیا انجمن ترقی پسند مصنفین کی موجودہ ادبی ڈکٹیٹری کا بھی یہی انجام ہونے والا ہے؟

اب نتیجے کے طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ادب ہے کیا۔ اس کا زندگی سے تعلق کیا ہے۔ ادب کی ماہیت کیا ہے اور اس کا مقصد کیا ہے۔ سیاست اور ادب یا مقصد اور ادب کا آپس میں کیا رشتہ ہے۔ مواد اور ہیئت میں باہمی کیا تعلق ہے۔ یہ سوالات آج سے ہزاروں سال پہلے سے لوگوں کے ذہن کے گرد چکر لگا رہے ہیں اور مختلف خیالات کا اظہار اس بارے میں کیا جا رہا ہے۔ ارسطو نے بھی اس معاملہ پر غور کیا تھا اسی لئے اس نے شاعری کو نقالی (IMITA I AON) سے تعبیر کیا تھا۔ مگر آج تک کسی ایک فیصلہ پر نہیں پہونچا جا سکا ہے۔ پھر بھی چند بنیادی باتیں ایسی ضرور ہیں جن کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ انھیں مدنظر رکھتے ہوئے ہم چند عام، اہم اور ضروری مفروضات قایم کر سکتے ہیں جس سے شاید ہی کسی مخلص ادیب کو انکار ہو۔ آج "ادب برائے ادب" "ادب برائے تفریح" یا "ادب برائے تعیش" جیسے نعرے لایعنی ہیں۔ میں نے اوپر بیان کیا ہے کہ دلی سے دور ہو جانے پر میر بھی شکوہ کرتے ہیں، اور اپنے اوپر خود مختاری کی تہمت لگائی جانے اور بدنام کئے جانے پر یہ کہنے کی ہمت بھی کرتے ہیں کہ کرتے تو آپ وہی ہیں جو چاہتے ہیں۔ مجھے مفت بدنام کرنے سے کیا فایدہ! چراغ مفلس کے بجھے سے رہنے پر ان کا بھی جی اداس ہوا ہے اور میں نے بیشتر بڑے شاعروں کے متعلق یہی کہا ہے کہ وہاں بھی زندگی کے چھینٹے مل جاتے ہیں۔ کمی یا زیادتی یا طریقہ استعمال کا سبب وہ خود نہیں ہیں بلکہ انکا زمانہ، ماحول اور ادبی شعور اس کا ذمہ دار ہے۔ ادب کو زندگی سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ زندگی کے لئے جس طرح کھانا پینا، روٹی کپڑا سونا اور کام کرنا ضروری ہے ویسے ہی ادب ضروری ہے۔ ادب اور زندگی کا رشتہ بڑا پرانا ہے۔ مگر زندگی سے میری مراد صرف سیاست نہیں، یا صرف روٹی یا صرف اشتراکیت نہیں، زندگی سے مراد وہی ہے جو بقول خورشید الاسلام "اونچی نیچی سڑکیں، چھوٹی بڑی دکانیں، جیٹھ کی دھوپ، برسات کی اندھیری بھیانک، مچل جانے والی راتیں، قہوہ خانے، گلابی جاڑوں میں نظریں بچا بچا کر مسکرانے والے پھول، جواری، پی کر گلاس چور چور کر دینے والے شرابی، فضا میں خوشبوئیں بکھیرنے والے دوپٹے، مرجھائے ہوئے معصوم چہرے، پرانی چیزوں کا نیا پن، سادگی میں بناوٹ، نیکیوں میں چھپی ہوئی کمزوریاں، پندار کی تہ میں انکسار، آلہا اودل، علم الکلام اور سنگر مشین" سے مشابہ ہے۔ یعنی ہر وہ شے جس کا تعلق انسانی تمدن کے تاریخی ارتقاء سے ہر زندگی میں داخل ہے۔ سیاست زندگی کا صرف ایک شعبہ ہے لہذا ادب میں بھی اس کی جگہ اسی تناسب سے ہو سکتی ہے۔ اور پھر اس کا تعلق مواد سے اور مواد کا تعلق ہیئت سے

یہی بنیادی پتھر ہے جس پر ادب کی عمارت کی تعمیر ہو سکتی ہے۔ ادب میں زندگی کی صرف مصوری، عکاسی یا نقالی نہیں ہوتی۔ بلکہ شاعر، ادیب یا فنکار وہ اگر بڑا اور اچھا شاعر، ادیب اور فنکار ہے تو یقیناً اپنے زمانے سے آگے ہوتا ہے اور زیادہ حساس ہوتا ہے، جو قیمتی اور انمول تجربات حاصل کرتا ہے انھیں پیش کرتا ہے ایک مصور کی طرح حسین، دیدہ زیب اور دلفریب رنگوں کی آمیزش سے ساتھ ہی ساتھ فنکار کی اپنی تنقید بھی پنہاں ہوتی ہے۔ ان تجربات کا براہ راست بیان نہیں ہوتا بلکہ حسین، مکمل اور موزوں بیان ہوتا ہے۔ اگر مقصد کا براہ راست اظہار ادب ہوتا تو پھر "کمیونسٹ مینی فسٹو" کیوں نہ دنیا کے بہترین ادبی پاروں میں شمار کیا جاتا؟ اور اگر حقیقت نگاری یا واقعات، تاثرات اور تجربات کا سیدھا سادھا بیان ادب میں شمار کیا جاتا تو پھر دنیا کے سارے اخبارات کیوں نہ ادبی شاہکار تصور کئے جاتے؟ صرف خیالات و تجربات ہی ادب نہیں پیدا کرتے۔ ان خیالات اور تجربات کی نوعیت کیا ہے وہ اچھے ہیں یا برے اور پھر ان کا اظہار کیسا ہے۔ حسین یا بھونڈا اسے ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ مواد اور ہیئت دو نہیں ایک ہیں۔ ایک کو دوسرے سے اسی طرح جدا نہیں کیا جا سکتا جیسے روح کو جسم سے۔ مواد اور ہیئت جسم و روح کے مترادف ہیں۔ یہی سبب ہے کہ انقلاب روس سے قبل کا ادب انقلاب کے بعد کے ادب سے زیادہ گراں قدر ہے اور جاگیردارانہ دور کے ادب کا ایک کثیر سرمایہ پرولتاری دور کے ادب کے بیشتر حصہ سے زیادہ بیش قیمت اور زیادہ ترقی پسند ہے۔ خیالات اور ان کا اظہار بہت کچھ ادیب کی شخصیت اور اس کے ماحول اور تاریخ تمدن انسانی سے اثر قبول کرنے کی صلاحیت پر منحصر ہے۔ اس لئے ادیب کو ماحول سے متاثر ہوتے ہوئے بھی اپنی منفرد آزادی اے رکھنی ضروری ہے۔ میں نے ماحول کی ترقی کے ساتھ ساتھ انفرادی ترقی پر اسی لئے زور دیا ہے۔ ادیب ماحول کی پیداوار ضرور ہوتا ہے مگر ماحول کی ترقی اور اس کی نئی نشو و نما اور تعمیر میں اس کی شخصیت کا بہت ہاتھ ہوتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ جب روس میں پرولٹیرین خیالات کے پرچار کے لئے ایک تنظیم "پیرولٹ کلٹ" کی بناء ڈالی گئی اور جب انھوں نے ادبی Regimentation شروع کیا تو وہ زیادہ دنوں تک نہ چل سکے۔ اور ۱۹۲۵ء میں کمیونسٹ پارٹی کے اجلاس میں یہ بتایا گیا کہ "کسی مزدور مصنف کی کتابوں کی مانگ نہیں ہے اور ناشر کو مجبوراً انھیں ترازو پر تول کر کوڑیوں کے مول بیچنا پڑتا ہے"۔ پھر پنج سالہ پروگرام کی تبلیغ کرنے کی غرض سے سرکاری انجمن "راپ" کی بناڈالی گئی اور حکومت نے اس جماعت کو ادبی ڈکٹیٹری سونپ دی، تب بھی یہ جماعت کامیاب نہ ہو سکی اور ۱۹۳۲ء میں ادبی پارٹی بندیوں کا خاتمہ کرنے کی نوبت آن پہونچی۔ نپولین، ہٹلر اور مسولینی نے بھی اپنے مقاصد کی ترویج کی غرض سے ادب کو استعمال کرنا چاہا اور ناکامیاب رہے۔ آخر مارکس کو ہین (Heine) اور گیٹے کیوں زبانی یاد تھے؟ شاید آپ کو واقفیت ہو مارکس نے Aeschylus کا مطالعہ یونانی زبان ہی میں کیا۔ مارکس کو شیکسپیر بہت عزیز تھا اور اس کی لڑکیوں کو بھی شیکسپیر کی لائنیں زبانی یاد ہو گئی تھیں۔ مارکس بہترین اور مناسب استعمال الفاظ کی تعریف کرتا تھا اور اسی لئے وہ گیٹے، لیسنگ، شیکسپیر، دانتے اور سروانٹیز کو روز پڑھتا تھا اسے پوری ڈیوائن کامیڈی زبانی یاد تھی اور شیکسپیر کی لائنیں اگر وہ بھول جاتا تو اس کی بیوی اسے یاد دلاتی۔ ڈارون اور بسمارک اور مارکس سب ناول کے دلدادہ تھے اور آپ کو یہ سن کر شاید تعجب ہو کہ مارکس، بالزک، فیلڈنگ اور سروانٹیز کے ساتھ ساتھ Paul de Kock اور Dumas, Ile Elder میں بھی کافی دلچسپی لیتا تھا۔ آخر یہ سب

کیوں ہوتا تھا۔ مارکس تو اپنے دور کا سب سے بڑا انقلابی تھا۔ بسمارک تو رجعت پرست نہ تھا۔ یہ اس لئے کہ ادب کی اپنی ایک الگ دنیا ہے جو معاشیات، تاریخ، ڈائری اور مینوفسٹو سے مختلف ہے۔ یہ ساری چیزیں ادب میں پائی جاتی ہیں مگر معاشیات اور تاریخ کی حیثیت سے نہیں ادب کی حیثیت سے۔ کیا وہ انتہا پسند ترقی پسند جو ترقی پسندی کو اشتراکیت کا بدل اور ادب کو سیاست کا ایک شعبہ، ایک نادر خزانہ تصور کرتے ہیں یہ بتا سکیں گے کہ گیٹے، دانتے، شیکسپیر، سروانتیز اور راسین کو ادبی تاریخ میں کون سی جگہ دی جائے؟ عصمت چغتائی، نیاز حیدر، سلام، فکر تونسوی اور مخمور جالندھری سے آگے یا پیچھے؟ انھیں چھوڑئیے میں بلا جھجک یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ کیا میر، غالب، انیس، اقبال، حالی، پریم چند، سرشار میں سے کوئی بھی سردار جعفری، ساحر لدھیانوی، احمد ندیم قاسمی، کرشن چندر، ہمت یا عبادت بریلوی سے کم مرتبہ رکھتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ کسی تھیوری پر ایمان رکھنا اور بات ہے، کسی انقلاب کی رہنمائی کرنا چیز دگر ہے مگر بڑا فنکار اور ادیب ہونے کے لئے یہ عناصر اسی قدر ضروری نہیں جس قدر ایک سیاسی لیڈر کی پلیٹ فارم تقریر، کسی جلسے کے ریزولیوشن اور پھر کسی افسانے یا نظم میں فرق ہے اور اسی فرق سے آج کے بیشتر ترقی پسند فنکار نابلد ہیں۔ یہ تجربات کے فرق کو محسوس نہیں کرتے۔ ان کی مثال لکھنؤ اسکول کے ان شعراء کی سی ہے جن کے تجربے میں صرف پردہ نشین عورت، بوالہوسی اور عیاشی آئی تھی، وہ ہجر، وصل، فراق، رقیب اور بیوفا معشوق کا رونا بار بار روتے تھے تو آپ سرخ ستاروں، سرخ پرچم، سرخ لب اور سرخ شفق کی شان میں رطب اللساں ہیں۔ طرز بیان ان کا بھی بھونڈا اور عریاں تھا آپ کا بھی ہے۔ عریانی ادب میں بذات خود کوئی بری شے نہیں بشرطیکہ فنی توازن برقرار رہ سکے۔ عریانی برائے اشتہائے جنس یا لذت اندوزی نہیں، بلکہ کسی اعلیٰ مقصد کے حصول کے لئے! جو کچھ زندگی میں واقع ہوتا ہے سب کا ادب میں آجانا ضروری نہیں۔ زندگی آمیز قدروں کا ادب میں وجود ضرور ہے۔ تحلیل جنسی کے لئے ایسے اشخاص کی ضرورت ہے جو خود نفسانی خواہشات کے شکار نہ ہو بیٹھیں۔ کیا جنسی موضوعات سے بحث کرنے والے بیشتر ادیبوں کو خود جنسی تجزیہ کی ضرورت نہیں ہے۔ ماحول، حالات یا نفسانی خواہشات کا غلام بن کر رہ جانا فنکار تو کیا کسی انسان کے لئے زیبا نہیں اسے تو ماحول سے دست و گریباں ہو کر منوں مٹی کے ڈھیر تلے دب کر ہیرا بن کر نکلنا ہے اور اسی آویزش اور جد و جہد کی عکاسی تجربات زندگی کے طور پر حسین اور فنی شکل میں ادب کے ذریعہ کرنی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ترقی پسند فیض اور بیدی جیسے فنکاروں کو نہ سراہ سکے۔ انھیں فن کا احساس ہے۔ انھوں نے چیزوں کو اس طور پر پیش کیا ہے جیسے انھیں محسوس کیا ہے اور جس طور پر انھوں نے ان کے ذہن میں گھر کر لیا ہے، سرکاری ترقی پسند شعراء میں سے بیشتر نے اپنے خیالات اس طور پر پیش کئے ہیں جس طور پر انھوں نے اُن خیالات کو سُن پایا ہے، اخباروں، پارٹی لٹریچروں میں پڑھ پایا ہے، کسی ساتھی کو تقریر کرتے سن لیا ہے یا کسی اشتراکی ادب کے خیالات کے بارے میں کسی نے کہدیا ہے۔ کیا ترقی پسند انجمن کے سنجیدہ نقاد ہمیں یہ بتائیں گے کہ فیض اور بیدی کو وہ ترقی پسندوں کی صف میں کہاں جگہ دینگے؟

---

میں احتشام حسین سے پوچھتا ہوں کہ کیا بہت سارے وہ فنکار جو انجمن سے سرکاری طور پر متعلق نہیں مگر آزادی کی حمایت میں، رجعت پسندی کی طاقتوں کی مخالفت میں عوام کو علم اور کلچر سے آشنا بنانے کے لئے، انسانیت کو سربلند کرنے کے لئے، دنیا کو ترقی کی راہ پر لگانے کے لئے، حقیقتوں سے روشناس کرانے اور حالات کے بدلنے پر آمادہ

کرنے کے لئے لکھ رہے ہیں تو وہ ترقی پسند نہیں ؟ آپ کے بیان کی رو سے تو وہ ترقی پسند ہوئے مگر سرکاری انجمن انھیں ترقی پسند تو کجا رجعت پرست مانتی ہے۔ پھر آپ کو کچھ کہنے کے لئے اس کا اعلان کرنا ہوگا کہ آپ کے خیالات ذاتی ہیں انجمن ترقی پسند مصنفین کے خیالات سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ اگر آپ کو اس سے انکار ہے تو انجمن کے سرکاری جلسوں کی تقاریر، تجاویز اور تحریروں اور آپ کے مضامین کے تضاد کا ذکر کیا جائے۔ میں نے جتنے سوالات کئے ہیں، موضوع کی مناسبت کے خیال سے انکا تفصیلی ذکر مناسب نہیں پھر بھی میں نے جابجا اشارے کئے ہیں۔ اگر حالات اسی طرح قایم رہے تو تحریک محدود ہو کر صفر رہ جائے گی۔ ادب، زندگی، مقصد، سیاست، کمیونسٹ پارٹی، مواد اور ہیئت میں تفریق کرنا ہوگا اور ان کے باہمی رشتہ کو صرف واضح کرنا نہیں، عملی طور پر ظاہر کرنا ہوگا۔

ہر بڑے فنکار کو حیات کے متعلق اپنا زاویۂ نگاہ رکھنا ضرور ہے۔ اسے بنیادی انسانی آدرشوں کا پرچار کرنا ہے۔ مگر اسے پروپگنڈا کا شکار ہو کر نہیں رہ جانا فن پر بھی توجہ دینا ہے تب وہ بڑا فنکار ہو سکتا ہے۔ عریانی اور جنس کو فن کے لئے مقصود بالذات سمجھنا ترقی پسندی کی علامت نہیں۔ صرف واقعہ نگاری کا دوسرا نام ادب نہیں۔ ادیب اور فنکار کو وقتی چیزوں سے اثر ضرور قبول کرنا ہے مگر اسکی تخلیقات کو وقتی بننے سے بچنا ہے۔ یہاں پر اس کی انفرادیت درکار ہے۔ انفرادیت، خارجیت، ماحول، عصریت اور داخلیت ایکدوسرے کی ضد نہیں بلکہ یہی وہ چونا، گارا اور سیمنٹ ہے جس پر عمارت ادب کی مستحکم بنیاد رکھی جا سکتی ہے۔ ادب کا مواد ہیرے کا ٹکڑا اور ہیئت اس کی تراش ہے جو اسے زینت دستار بناتی ہے۔ مواد خارجی، عصری اور سماجی اثرات ضرور قبول کرتا ہے۔ ہیئت کا تعلق زیادہ تر فنکار کی اپنی شخصیت اور اس مواد کو پیش کرنے کی صلاحیت سے ہے۔ سنگ مرمر کا ایک بیکار ٹکڑا چاہے وہ سنگ مرمر ہی کا کیوں نہ ہو، مٹی کے اس ٹکڑے سے یقینی بہتر نہیں جسے لیونارڈو ڈاونچی، رفائل یا مائیکل انجیلو نے ایک صورت، ایک حسین شکل دے کر لافانی بنا دیا ہو۔ مواد کی حیثیت الہامی نہیں ہونی چاہئے اور نہ فنکار کو ان خیالات کو بار بار دہرانا چاہئے جو متعدد بار دہرائے جا چکے ہیں۔ اسے اپنے خیالات کو جس طور پر وہ محسوس کرتا ہے اپنے انفرادی رنگ میں پیش کرنا ہے تاکہ سب اس کی جانب رجوع ہوں اور پھر اس کا مقصد بر آئے، لوگوں پر اس کا اثر دور رس اور دلپذیر ہو، ہنگامی اور وقتی اور جذباتی نہ ہو۔ محض ایک شعبہ حیات، چند نعرے، چند فقرے اور چند موضوعات پر چیخنے کا انجام یہی ہو سکتا ہے جو آج اس انجمن کا ہوا۔ موضوعات ختم ہو گئے اور گلا بھی سوکھ گیا۔ انھیں ادیبوں اور فنکاروں نے پانچ سال پہلے جو کچھ لکھا آج وہی اس سے گھٹیا ادب پیدا کر رہے ہیں۔ ان کی دوکان کی رنگا رنگی ختم ہو چکی۔ وہاں تو بے نمک سالن اور ابالی کھچڑی کا پتہ بھی نہیں۔ ادیبوں کو حالات، واقعات اور اصولوں کا غلام ہو کر نہیں رہ جانا۔ اپنی بھی کچھ کہنا ہے۔ انھیں صرف ایک "ازم" یا ایک موضوع سے واقفیت نہیں پیدا کرنی۔ تمام اصولوں بلکہ تاریخ تمدن انسانی، نفسیات، معاشیات، سیاسیات اور مختلف زبانوں کے ادب کا بغور، ٹھنڈے دل سے اور غیر جانبدارانہ مطالعہ کرنا ہے۔ فنکار کے لئے نہ تو فطرت اور اس کے ذہن کے بیچ کوئی پردہ حائل ہے اور نہ ہی اس کے اور اس کے شعور کے بیچ کوئی رکاوٹ۔

غلام سرور

# ہندوستان کا اولین ریاضی داں

## (آریا بھٹ)

آریا بھٹ کے زمانے میں مروجہ زبان جس میں اعلیٰ تعلیم دی جاتی تھی سنسکرت تھی جس کا اثر ہندوستان پر تقریباً دو ہزار سال تک رہا۔ یہ امر نہایت قابل افسوس ہے کہ آریا بھٹ کے پیش رووں یا اس کے ہمعصروں کی تصانیف باضابطہ طور پر نہیں پائی جاتیں بلکہ منتشر صورت میں بعض بعض جگہ ملتی ہیں، آریا بھٹیہ (Aryabhattiya) اس کی بہت مشہور کتاب ہے۔ شکاگو (امریکہ) کے پروفیسر والٹر کلارک (Walter Clark) آریا بھٹیہ کے مترجم لکھتے ہیں:-

"ہندوستانی ریاضی اور علم نجوم سے متعلق سب سے قدیم محفوظ کتاب جس میں سائنٹیفک نقطۂ نظر سے علم نجوم اور علم ریاضی کے مسایل نہایت شرح وبسط کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں آریا بھٹیہ ہے"

یوں تو بہت سے آریا بھٹ ہوئے ہیں لیکن یہاں میرے مضمون کا تعلق صرف ایک آریا بھٹ سے ہے جو قدیم تاریخ کے مطابق ۴۷۶ء سے ۵۵۰ء تک تھا، اور حالیہ تحقیق کے مطابق اس کا عہد ۴۹۹ء سے ۵۷۰ء تک بیان کیا جاتا ہے۔ آریا بھٹ کے سارے مضامین ایک ہی کتاب میں جمع کر دئے گئے ہیں جس کا نام آریا بھٹیہ ہے اور یہ سنسکرت نظم میں ہے۔ کتاب چار حصوں میں تقسیم کی گئی ہے۔ پہلا حصہ "گیتکا پد" (Gitika Pad) ہے۔ دوسرے حصے کا نام "گنت پد" (Ganit-Pad) ہے۔ تیسرے حصہ کو "کل کریا پد" (Kal-Kriya-Pad) اور چوتھا حصہ "گول پد" (Gol-Pad) کے نام سے موسوم ہے۔

پہلا حصہ خدائے برتر کی حمد کے ساتھ شروع ہوتا ہے اس کے بعد مصنف کا نام، دیباچہ اور آخر میں اسکے حالات زندگی درج ہیں۔ دوسرے حصے میں علم ریاضی کا بیان ہے، تیسرے حصے میں وقت کا اندازہ لگانے کا طریقہ بیان کیا گیا ہے اور چوتھے حصہ میں کُردی علم مثلث (Spherical Trigonometry) کی تشریح کی گئی ہے۔ اس کا پہلا مکمل سنسکرت ترجمہ ۱۸۷۵ء میں پہلی بار ایچ کرن (H. Kern) کی طرف سے ہالینڈ میں لیڈن (Leiden) سے شایع ہوا۔ اس کا دوسرا باب جو علم ریاضی پر مشتمل ہے اس کا فرانسیسی ترجمہ ۱۸۷۸ء میں ایل۔ روڈٹ (Leconge (L. Rodet)

(de Calcul d'Aryabhat) کے عنوان سے کیا ہے جس کا نقش ثانی ۱۸۷۹ء میں شایع ہو چکا ہے اس کے سنسکرت ترجمہ کا دوسرا ایڈیشن مظفر پور (بہار) سے ۱۹۰۶ء میں اودے نراین سنگھ کی ہندی تشریحوں کے ساتھ شایع ہوا۔

اس کے آخر کے تینوں حصے ( Sambha Shiva Sastri ) تراونڈرم کی طرف سے سنسکرت میں جستہ جستہ شایع کئے جا رہے ہیں - دوسرا حصہ جو گنت پد ( Ganit - Pad ) پر مشتمل ہے، تیسرا حصہ جس میں ( Kal-Kriya Pad ) کا بیان ہے ۱۹۳۰ء میں شایع ہوئے اور چوتھا حصہ زیر طبع ہے -

حسب ذیل تین مصنفوں، جی - آر - کائے ( G. R. Kaye ) کلکتہ نے قدیم کتابوں کے بہت بڑے دلدادہ ہیں ۱۹۰۸ء میں، پربودھ چندر سین گپتا ( Probodh Chandra Sen Gupta ) کلکتہ نے ۱۹۲۷ء میں اور ( W. E. Clark ) شکاگو نے ۱۹۳۰ء میں آریا بھٹیہ کا انگریزی ترجمہ کیا -

کتاب کی اہمیت کے پیش نظر مصنف کے حالات زندگی سے واقفیت حاصل کرنا قطعی طور پر ایک فطری امر ہے جس کی تحریروں نے عالمگیر دلچسپی کا سامان پیدا کر دیا اور جس کی کتاب کے بہت سارے تراجم اور اڈیشن طبع ہوئے اور ہنوز اس کا سلسلہ جاری ہے -

——— اگر ہم آریا بھٹ کے ابتدائی حالات کی تحقیق و تفتیش کریں جو ہندوستان کا اولین ریاضی داں سمجھا جاتا ہے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ لوگ اس کے سوانح، اس کی پیدائش اور اس کے کارہائے نمایاں کے متعلق صرف اتنا جانتے ہیں کہ وہ چھٹی صدی عیسوی میں ( ۴۹۹ء - ۵۷۰ء ) پٹنہ میں زندگی کے دن گزار رہا تھا - اسوقت پٹنہ کو " پاٹلی پتر " کہتے تھے، اور یہ گپتا سلطنت کا پایۂ تخت تھا - ایک بڑی سلطنت کا پایۂ تخت ہونے کی وجہ سے بعضوں نے اسے ہندوستان کا ( Rome ) کہا ہے - پٹنہ میں آریا بھٹ نے ریاضی کا ایک اسکول قایم کیا اور طالبعلموں کی ایک جماعت کو تعلیم دی، اس کی شہرت چہار دانگ عالم میں پھیل گئی - یہاں تک کے غیر ممالک کے مشہور و معروف اہلِ علم اور مذہبی رہنما علمی پیاس بجھانے کے لئے ہندوستان آئے - " پاٹلی پتر " میں مصوری، ادب، سائنس اور مذہب کی اس قدر ترقی ہوئی کہ یہ ہندوستان کا آکسفورڈ ( Oxford ) کہلانے لگا -

——— اس سلسلہ میں ہمیں معلوم ہوگا کہ آریا بھٹ نے عدد پڑھنے میں مقامی قیمت (Place Value) کا اصول اور نشان کے لئے نقطہ کا رواج کس طرح جاری کیا - عدد کا نام مثلاً اکائی، دہائی، سیکڑہ اور اعشاریہ کا پیمانہ ( Decimal Scale ) بھی وہ استعمال کرتا تھا، جذر المربع ( Square Root ) اور جذر المکعب ( Cube Root ) کی تفریق کا قاعدہ بھی اس نے ہمیں بتایا اور مثلث کے دریافت کرنے کرہ اور اہرام ( Pyramid ) کا حجم معلوم کرنے کے قاعدے مقرر کئے -

( اہرام کا حجم = $\frac{1}{2}$ چوڑائی × اونچائی، کرہ کا حجم = $\frac{3}{11}$ (نصف قطر)$^3$ ) اور ثابت کر دیا کہ $\pi = \frac{3927}{1250} = 3.1416$ اور

الٹ پلٹ کرنے کا طریقہ ( Method of Inversion ) جس کی مثالیں یورپ اور امریکہ میں سولھویں صدی عیسوی میں بہت عام تھیں، آریا بھٹ کا بہت دلچسپ تفریحی مشغلہ تھا -

مربع مساوات (Quadratic Equation) اور غیر معین مساوات (Indeterminate Equation) کے حل کرنے کا طریقہ اسے معلوم تھا جو اس کے علم نجوم کے مسایل کی تخلیق تھے۔ اس نے حسب ذیل اصول (Formula) کو استعمال میں لاتے ہوئے علم مثلث کے علامات کا ایک نقشہ طیار کیا:

$$\text{Sin}(n+1)A \text{ Sin } nA = \text{Sin } nA - \text{Sin}(n-1)A - \text{Sin } nA \text{ Cosec } A.$$

اگرچہ اس اصول میں کچھ نقص تھا لیکن دس صدی قبل اس نے دنیائے ریاضی میں ایک سنسنی پیدا کر دی تھی۔

اس کے مشاہداتی علم نجوم کے مطالعہ پر خاص طور سے زور دیا گیا ہے۔ موجودہ رصد گاہوں کی صفائی کے بغیر اس نے نتائج استخراج کئے۔ ان نتائج میں ان رصد گاہوں کے نتائج سے بہت تھوڑا فرق ہے جو موجودہ آلات تحقیق و درستگی کی مدد سے تعمیر کیگئی ہیں۔ اس کا خیال تھا کہ زمین، گنبد فلک، آفتاب، ماہتاب اور سیارے گروی ہیں۔ اور اس نے زمین کے قطر کا تخمینہ ۱۰۵۰ Yojans، ماہتاب کا مطول قطر (Linear Dimeter) ۳۱۵ Yojans لگایا تھا و نیز ماہتاب کی اصطلاح میں ہر سیارہ کا مطول قطر (Linear Dimeter) یعنی زہرہ، مشتری، عطارد، زحل اور مریخ کا مطول قطر (Linear Dimeter) بالترتیب ماہتاب کا $\frac{1}{5}$، $\frac{1}{10}$، $\frac{1}{15}$، اور $\frac{1}{20}$ اور $\frac{1}{25}$ تھا۔

اس نے آسمان کا نقشہ بنایا، چھوٹے چھوٹے ستاروں کے مجموعوں، خاص خاص ستاروں اور بروج کا ایک خاکہ تیار کیا، اس کا خیال تھا کہ خط استوا لنکا سے ہو کر اور مخصوص خط نصف النہار (Prime Meridian) لنکا اور اجین (گوالیار میں اندور کے قریب) سے ہو کر گزرتا ہے۔

اجین کا عرض البلد اس کی پیمایش کے مطابق ۲۲ ½ درجہ شمال میں تھا، لنکا میں شہری ضروریات کے لئے دن کی ابتدا طلوع آفتاب سے اور علم نجوم کی ضروریات کے لئے نصف شب سے شمار کی جاتی تھی۔ علم نجوم کے بعض نتائج جو اس نے اخذ کئے ہیں قابل ذکر ہیں:-

| | آریا بھٹ | موجودہ |
|---|---|---|
| (۱) طریق الشمس کا جھکاؤ (بجہم جانب | ۲۴ درجہ | ۲۳ ½ درجہ |
| (۲) طریق الشمس پر ماہتاب کے مدار کا جھکاؤ | ۴½ " | ۵ " |
| " " مریخ " " | ۱½ " | ۱½ " |
| " " مشتری " " | ۱ " | ۱⅓ " |
| " " زحل " " | ۲ " | ۲½ " |

آریا بھٹ (Geocentric Theory) کا قایل تھا، اور اس نے سیاروں کے حرکات اور ماہتاب کی بے قاعدہ حرکت کو دائروں (Circles) اور (Epicycles) کے مناسب اجتماع یا میل جول کے ذریعہ تشریح کرنا چاہی۔ آریا بھٹ نے یہ خیال ظاہر کر کے کہ زمین اپنے طور پر گردش کرتی ہے جس کی وجہ سے

آسمانی مخلوقات (سیارے وغیرہ) روزانہ طلوع اور غروب ہوتے ہیں۔ زمین کی اس روزانہ گردش سے اس نے علم ریاضی کی ایک نہایت تعجب خیز دریافت یعنی گشش زمین کے نظریہ کو بطور نتیجہ اخذ کیا اور اس کی توسیع اشاعت کی۔

یہ امر قابل تعجب نہیں کہ آریا بھٹ کی فطری صلاحیتوں اور تخلیقی قوتوں نے تمام دنیا کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کر لیا، اس کی کارگزاریوں کے مترتب ریکارڈ اور اس کے نتائج کا صرف سولھویں اور سترھویں صدی کے ماہرین ریاضی سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے، جس وقت خوردبین کی ایجاد عمل میں آئی اور قوانین کپلر (Laws of Kepler) متعین کئے گئے۔ بہرکیف، اس کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ آریا بھٹ نے ایک گراں قدر سرمایہ اور ختم نہ ہونے والی متاعِ بے بہا ریاضی کی تحقیق و تدقیق کے لئے چھوڑی ہے۔ اگرچہ آریا بھٹ اہم میں نہیں ہے لیکن اس کی آریا بھٹیہ نے اسکو غیر فانی بنا دیا ہے۔ (ماخوذ)

کلیم سہسرامی

---


انقلاب حیدرآباد کی داستان پر پہلی کتاب

# "مشاہدات"

یعنی

## حضرت ہوشؔ بلگرامی

(المخاطب بہ نواب ہوشیار جنگ بہادر)

کے خود نوشتہ سوانح زندگی جو نہ صرف اپنی بلند انشاء بلکہ سیاسیات و مذہبیات پر بھی ایک بے لاگ حکیمانہ تبصرہ کے لحاظ سے اپنے رنگ کی بالکل پہلی کتاب ہے۔ جناب ہوشؔ کی عمر کا بڑا حصہ ریاستوں ہی میں بسر ہوا ہے اور ان کی پالٹکس کو مشکل ہی سے کسی نے ان سے بہتر سمجھا ہوگا۔

یوں تو اس میں رامپور، بھوپال، گوالیار، اودے پور، الور، جے پور وغیرہ متعدد ریاستوں کے دلچسپ حالات نظر آتے ہیں لیکن کتاب کا وہ حصہ جو "ریاست حیدرآباد اور اس کے انقلاب" سے تعلق رکھتا ہے، دیکھنے کی چیز ہے کیونکہ اس کتاب کے لکھنے کا مقصود ہی حیدرآباد کی تاریخ پیش کرنا تھا۔ جناب ہوشؔ ایک چوتھائی صدی سے حیدرآباد کی پالٹکس اور دربار عثمانی کے رجحانات کا مطالعہ کر رہے تھے اور نظام کے یہاں ہر وقت کی حضوری کی وجہ سے وہاں کی ان تمام اندرونی سازشوں اور ریشہ دوانیوں سے واقف تھے جو کسی دوسرے کے علم میں آ ہی نہ سکتی تھیں — رضاکار تحریک، ارباب حکومت کی سازشیں، سچے مشیروں کی مشکلات، دربار عثمانی کے حیرتناک حالات، سیرت نظام کی عجیب و غریب خصوصیات، پولس ایکشن کی داستان، اور اس کے بعد نظام اور اہل ملک پر اس کا ردعمل۔ اگر آپ کو ان تمام واقعات کی صحیح تصویر دیکھنا چاہتے ہیں تو "مشاہدات" ملاحظہ فرمائیے

کاغذ دلایتی، حجم ۴۰۰ صفحات، ۱۰ تصاویر، نفیس جلد، قیمت دس روپے علاوہ محصول۔ مینجر نگار لکھنؤ

# اُردو کا پہلا واسوخت

غالباً حضرت امیر خسرو دہلوی سب سے پہلے مصنف تھے جنھوں نے "ہندوی" زبان میں بتیں سنائیں، گیت گائے پہیلیاں بجھوائیں، دوسخنے بیان کئے۔ ان چیزوں نے بقائے دوام اور قبول عام کا خلعت پہن لیا ہے۔ اگرچہ ان تمام چیزوں کی نسبت امیر خسرو کی طرف مشکوک سمجھی گئی ہے تاہم اس قدر یقینی ہے کہ ان میں سے کچھ چیزیں انہی کی کاوش فکر کا نتیجہ ہیں۔ موصوف کی پیدائش کا سال ۱۲۵۵ء اور سن وفات ۱۳۲۵ء ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تیرھویں صدی عیسوی کے اواخر میں اُردو شاعری کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ اُردو نثر کی ابتدا کب ہوئی اس بات کی تحقیق مشکل ہے۔ سب سے پہلی کتاب جو نثر میں لکھی گئی اور اب حیدرآباد سے چھپ کر شایع ہو چکی ہے معراج العاشقین ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس مذہبی رسالہ کے مصنف حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز ہیں۔ خواجہ صاحب ۱۳۴۱ء میں پیدا ہوئے اور ۱۴۲۲ء میں انھوں نے وفات پائی۔ گویا یہ کتاب چودھویں صدی عیسوی کے اواخر میں لکھی گئی تھی۔ بہرکیف اُردو زبان کی پیدائش کو کم از کم ساڑھے چھ سو سال تو ضرور ہوئے۔

لیکن کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ اُردو زبان کی صحیح و مکمل، جامع و مبسوط تاریخ اب تک مرتب نہ ہو سکی۔ اُردو شاعری کے ابتدائی دور میں کوئی تذکرہ نہیں لکھا گیا، یہی وجہ ہے کہ اُردو زبان کی ابتدائی تاریخ تاریکی میں ہے۔ سب سے پہلا تذکرہ میر نے ۱۱۶۵ھ (م ۱۷۵۲ء) میں لکھا جس کا نام نکات الشعرا ہے۔ گردیزی نے بھی اسی سال اپنا تذکرہ مرتب کیا۔ اُسکے بعد متعدد تذکرے لکھے گئے، مثلاً قایم کا مخزن نکات (۱۱۶۸ھ)، میر حسن کا تذکرۂ شعرا (۱۷۷۶ء) خلیل عظیم آبادی کا گلزار ابراہیم (۱۷۸۳ء)، شفیق کا چمنستان شعرا (۱۱۷۵ھ)، مصحفی کا تذکرۂ شعرائے ہندی (۱۲۰۹ھ) اور ریاض الفصحا (۱۲۳۶ھ)، قاسم کا مجموعۂ نغز (۱۲۲۱ھ)، شیفتہ کا گلشن بیخار (۱۲۵۰ھ) لطف کا گلشن ہند (۱۲۱۵ھ / ۱۸۰۱ء) وغیرہ وغیرہ۔ تذکروں کی فہرست نہایت طویل ہے اس لئے نظر انداز کرتا ہوں۔ ان تذکروں میں خامیاں بہت ہیں۔ ان میں علمی ترتیب کی بڑی کمی نظر آتی ہے۔ تذکرہ نویس حضرات نہ زبان کی ابتدا اور نشو و نما سے بحث کرتے ہیں نہ شعرا کے حالات تفصیل سے لکھتے ہیں، نہ زبان کے ارتقا کے مدارج دکھاتے ہیں نہ شعرا کی شخصیت کو اجاگر کرتے ہیں۔ ان حضرات کو تحقیق و تنقید سے دور کا بھی لگاؤ نہیں تنقید کا یہ حال ہے کہ اس کو مشاعرے کی واہ واہ اور سبحان اللہ سے زیادہ اہمیت نہیں دیجا سکتی۔ جدید اصول پر سب سے پہلے آزاد نے تقریباً ۱۸۸۰ء میں آبحیات لکھی، جس میں زبان کی تاریخ سے بھی بحث کی اور شاعری کے مختلف دور قایم کر کے

تدریجی ارتقا بھی دکھایا، شعرا کے حالات بھی ذرا تفصیل سے بیان کئے اور ان کے کلام پر اپنی سمجھ اور صلاحیت کے مطابق تنقید بھی کی۔ آزاد کی انشا پردازی مسلم ہے، ان کی تحریر میں تمثیلی کیفیت پائی ہے۔ آبحیات میں شعرا چلتے پھرتے، ہنستے بولتے، مشاعروں میں شرکت کرتے اور شعر پڑھتے نظر آتے ہیں۔ یہ خوبی کسی اور تذکرے میں نہیں پائی جاتی۔ لیکن اس کتاب میں تاریخی ثقاہت کی بڑی کمی ہے۔ آزاد کے بہت سے بیانات غیر مستند بلکہ بعض محض بے بنیاد ہیں۔ تذکروں میں ایک بڑی فروگزاشت یہ نظر آتی ہے کہ عموماً صرف شعرا کا ذکر کیا جاتا ہے اور نثر نگاروں کا کچھ ذکر ہے بھی تو اسی قدر جتنا آٹے میں نمک ہوتا ہے، تقریباً پچیس سال کے اندر دکن سے کئی تذکرے شایع ہوئے ہیں مثلاً اُردوئے قدیم، دکن میں اُردو، اُردو شہپارے، ان کتابوں میں قدیم ادبیات اُردو سے بحث کی گئی ہے۔ ارباب نثر میں اُن قدیم اُردو مصنفین کا ذکر ہے جن کا تعلق فورٹ ولیم کالج سے تھا۔ پنجاب میں اُردو از محمود شیرانی، اس کتاب میں اس بات کا دعویٰ کیا گیا ہے کہ اُردو کی ابتدا پنجاب میں ہوئی۔ اُردو شہپارے میں ولی کے دور تک کی ادبیات سے بحث کی گئی ہے۔ مولوی محمد یحییٰ تنہا نے سیر المصنفین دو جلدوں میں لکھی لیکن تحقیق سے مطلق کام نہ لیا اور آزاد کی اندھی تقلید میں اُردو کی پیدائش کا غلط نظریہ بیان کیا اور قدیم نثر نگاروں کو یکسر نظر انداز کر دیا۔ یہ کتاب نثر نگاروں سے متعلق ہے لیکن آبِ حیات کے ابتدائی صفحات کی صدائے بازگشت معلوم ہوتی ہے۔ سکسینہ کی تاریخ ادب اُردو میں نظم و نثر سے بحث کی گئی ہے، لیکن ادب شناسوں کے ذوق کی پوری آسودگی نہیں ہوتی کیونکہ تنقید و تبصرہ میں افراط و تفریط پائی جاتی ہے۔ مرزا محمد عسکری صاحب نے اس کتاب کا ترجمہ کرکے بہت سی مفید اور قابلِ قدر باتیں اضافہ کی ہیں، پھر بھی قدیم اُردو لٹریچر کی تاریخ نامکمل رہ گئی۔ اس سے بہتر کتاب ڈاکٹر بیلی کی تاریخ ادب اُردو ہے جس میں دریا کو کوزے میں بند کرنے کی کوشش کی گئی ہے افسوس ہے کہ ڈاکٹر بیلی نے بھی متعدد جگہ ٹھوکریں کھائی ہیں اور ان کے بیانات انتہا سے زیادہ مختصر، نامکمل اور تشنہ ہیں۔ مذکورۂ بالا پنجابی اور دکنی تذکرے بھی جامع اور مکمل نہیں اور ان کے نام ہی سے ان کی چوحدی متعین ہو جاتی ہے۔

غرضکہ میرا نظریہ اپنی جگہ پر قایم ہے یعنی اُردو زبان کی صحیح و مکمل اور جامع و مبسوط تاریخ کسی نے اب تک نہیں لکھی خمخانۂ جاوید ہے تو بہت مبسوط تذکرہ جو کئی جلدوں میں تمام ہوا ہے لیکن اس کو شاعروں کی فہرست کہنا زیادہ موزوں ہے۔ اُردو کی جامع اور مکمل تاریخ کی ترتیب و تدوین میں بہت سی دقتیں سد راہ ہیں۔ کتنے مصنفین ہیں جن کے نام سے بھی لوگ آشنا نہیں اور جنکی تصنیفیں بعوز گوشۂ گمنامی میں پڑی ہوئی ہیں۔ خاصکر صوبۂ بہار کے ارباب ادب کی طرف بہت بے توجہی برتی گئی ہے۔ ضرورت ہے کہ ان تمام قلمی کتابوں کو شایع کر دیا جائے اور ان کے مصنفین کے سنین ولادت و وفات اور ضروری ضروری حالات کی تحقیق کی جائے یہ راہ بڑی دشوار گزار ہے، اس "ہفتخواں" کو طے کرنے کے لئے رستمانہ جرأت کی ضرورت ہے۔ ابھی تک عوام کو اس کا صحیح علم نہیں کہ پہلا غزل گو اور قصیدہ گو کون تھا، سب سے پہلے رُباعی اور مثنوی کس نے لکھی اور داسوخت کی اولیت کا تاج کس کے سر پر رکھا جائے۔ جن شعرا و ادبا نے کافی شہرت بھی حاصل کرلی ہے اُن میں سے بھی بعض ایسے ہیں جن کی ولادت یا وفات کا صحیح سال معلوم نہیں۔ مثلاً پبلک کو ہنوز معلوم نہیں کہ ولی دکنی کس سال پیدا ہوئے اور کب مرے، میر و سودا، مصحفی و انشا،

تاسخ واسوخت کا صحیح سال ولادت کیا ہے۔ بعض شعرا کے سال ولادت و وفات کی تعیین کی کوشش بھی جو کی گئی ہے وہ محض ظنی و قیاسی ہے۔ اسی لاعلمی کا نتیجہ ہے کہ مضمون نگار حضرات اپنے مضامین میں قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتے ہیں۔ اس لئے ضرورت ہے کہ ایک مجلس ادارہ قایم کی جائے جس کے ارکان اُردو زبان کی تاریخ کا صحیح علم رکھتے ہوں، اُن کی طبیعت میں تحقیق و تنقید کا کافی مادہ ہو، مذاق صحیح اور وجدان سلیم ہو، شعر و ادب کا ذوق بلند ہو اور انشا پردازی بھی اچھی خاصی ہو۔ اور یہ مجلس ایک ایسی مبسوط تاریخ مرتب کرے جو جامع و مکمل اور صحیح و معیاری ہو۔ لیکن اس اہم خدمت کے سرانجام کی اب توقع نہیں ا۔

تہی ساغر حریفاں مستِ خواب انصاف کو ساقی　　دل ما ذوق صافی دارد اما صاف کو ساقی

اس مقالے میں مجھے واسوخت کی ایجاد سے متعلق کچھ کہنا ہے۔ واسوخت معاملہ بندی کی انتہا ہے، اس میں معشوق سے جلی کٹی باتیں کی جاتی ہیں اور ظلم و ستم سے مجبور ہو کر کسی اور پری پیکر سے دل لگانے کی دھمکی دی جاتی ہے۔ واسوخت کی ابتدا ایران میں ہوئی اور سب سے پہلے وحشی یزدی نے واسوخت لکھا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اُردو میں واسوخت کی ایجاد کا سہرا کس کے سر ہے۔ نگار ۱۹۵۰ء کے اگست نمبر میں محمد حسن صاحب ایم اے نے واسوخت پر ایک مضمون لکھا ہے لیکن انھوں نے اس مضمون میں واسوخت کی ایجاد سے متعلق کوئی تحقیق پیش نہیں کی ہے، محض آزاد کا قول نقل کرنے پر اکتفا کی ہے کہ واسوخت کے موجد میر ہیں، عظیم آباد کے رسالہ معاصر ۱۹۴۱ء کے ستمبر نمبر میں اُردو زبان کے مشہور محقق قاضی عبدالودود بار ایٹ لا نے ایک تحقیقی مقالہ بہ عنوان "اُردو کا پہلا واسوخت" سپردِ قلم کیا ہے جس میں واسوخت کی ایجاد سے بحث کی ہے لیکن حسب عادت بہت اختصار سے کام لیا ہے۔ کاش اس مضمون میں کچھ اور کاوش اور تفصیل سے کام لیا جاتا۔ ابھی تک دنیا یہی جانتی تھی کہ اُردو میں سب سے پہلے میر نے واسوخت لکھا۔ لیکن قاضی صاحب نے تحقیق کا قدم آگے بڑھایا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اُردو میں واسوخت کے موجد شاہ مبارک آبرو تھے جن کا سال وفات قاضی صاحب کی تحقیق کے مطابق ۱۱۴۶ھ ہے۔ میر کی پیدایش غالباً ۱۱۲۵ھ میں ہوئی، گویا میر صرف گیارہ سال کے تھے کہ آبرو نے وفات پائی۔ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ جو واسوخت قاضی صاحب نے پیش کیا ہے وہ آبرو ہی کا لکھا ہوا ہے تو ماننا پڑے گا کہ آبرو ہی واسوخت کے موجد تھے۔ قاضی صاحب کے مضمون مذکورہ سے متعلق کچھ اور باتیں بیان کرنا چاہتا ہوں۔

قاضی صاحب رقم طراز ہیں کہ "میر کے کلیات مطبوعہ میں دو واسوخت ہیں۔ ان کے ابتدائی مصرعے یہ ہیں ا۔

(۱)　طرز اے رشک چمن اب تری کچھ تازی ہے

(۲)　سچ کہو شہر میں صحرا میں کہاں رہتے ہو"

لیکن یہ بیان محل نظر ہے کیونکہ جب میں مطبوعہ کلیات پر نظر ڈالتا ہوں تو دو ہی نہیں بلکہ چار واسوخت ملتے ہیں۔ محمد حسن صاحب ایم اے بھی لکھتے ہیں کہ میر کے چار واسوخت نہ صرف ان کے مطبوعہ دیوان میں موجود ہیں بلکہ واسوختوں کے ان تمام مجموعوں میں موجود

ہیں ——— بلکہ واسوختوں کے ان تمام مجموعوں میں بھی شامل ہیں جو اسی دور میں لکھنؤ سے شایع ہوئے تھے۔ میرے پاس کلیات میر کا ایک پُرانا نسخہ ہے جو "مطبع نامی منشی نولکشور" میں طبع ہوا تھا، سن طباعت درج نہیں ہے۔ اس میں میر کے چار واسوخت موجود ہیں۔ میں ہر واسوخت کا پہلا بند نقل کر دیتا ہوں :۔

(۱) طرز اے رشک چمن اب تری کچھ تازی ہے — ساتھ غیروں کے مرے حق میں سخن سازی ہے
داغ رکھنے کو مرے اُن ہی سے گل بازی ہے — ہمدمی ان سے انہی سب سے ہم آوازی ہے
گوش کر میرے بھی شکوے کی طرف گل کے رنگ
رکتے رکتے روش غنچہ ہوا ہوں دل تنگ

(۲) سچ کہو شہر میں صحرا میں کہاں رہتے ہو — یاں بہت رہتے ہو خوشباش کہ واں رہتے ہو
ان دنوں یاروں کی آنکھوں سے نہاں رہتے ہو — خوش رہو میر مری جان جہاں رہتے ہو
اک طرف بیٹھے ہوئے ہم بھی لہو پیتے ہیں
عشق کی جان کو دیتے ہیں دُعا جیتے ہیں

(۳) یاد ایام کہ خوبی سے خبر تجھکو نہ تھی — سرمہ و آئنہ کی اور نظر تجھکو نہ تھی
فکر آراستگی شام و سحر تجھکو نہ تھی — زلف آشفتہ کی سدھ دو دو پہر تجھکو نہ تھی
شانہ تھا نابلد کوچۂ گیسو تیرا،
آئنہ کا ہے کو تھا حیرتی رو تیرا

(۴) ایک دن وے تھے کہ تم کو نہ فریب آتے تھے — اولے سولے بھی مرے آگے اُٹھا جاتے تھے
مدعی کا ہیکو مجلس میں جگہ پاتے تھے — چھوتے تھے پاؤں تو پھر سر میں وہی کھاتے تھے
یا تو اب شام و سحر پاس لگے رہتے ہیں
کر کے سرگوشی جو کچھ چاہتے ہیں کہتے ہیں

غالباً اب کسی شک و شبہ کی گنجایش نہیں کہ میر کے چار واسوخت ہیں :۔

آگے چل کر قاضی صاحب فرماتے ہیں کہ " ایسے شعرا کے کلام کا جایزہ لینے سے جو زمانہ کے اعتبار سے مقدم ہیں حسب ذیل واسوختوں کا پتہ چلتا ہے :۔

(۱) سودا (سال ولادت ۱۱۵ھ کے لگ بھگ اور سال وفات ۱۱۹۵ھ) کلیات مطبوعہ (نولکشوری) میں ایک واسوخت ہے :۔

یا الٰہی کہوں اب کس سے میں اپنا احوال — زلف خوباں کی مرے دل کو ہوئی ہے جنجال

(۲) حشمت (سال ولادت قریب ۱۱۱۰ھ سال وفات ۱۱۶۳ھ) ایک قدیم بیاض میں جو جناب حکیم سید محمد صالح صاحب کی ملک ہے اور کچھ کم دو سو سال قبل کی لکھی ہوئی ہے حشمت کا وہ واسوخت ملتا ہے جس کا ذکر تذکرۂ میر حسن میں ہے :-

کیوں رے دل جاہی پھنسا میں نہ تجھے کہتا تھا عشق ہے دام بلا میں نہ تجھے کہتا تھا

(۳) تاباں (سال ولادت ۱۱۲۵ھ اور ۱۱۳۰ھ کے درمیان - وفات ۱۱۶۲ھ اور ۱۱۶۵ھ کے درمیان) دیوان مطبوعہ میں ترکیب بند کے نام سے ایک واسوخت درج ہے :-

ہرن مو کے تئیں اپنے زباں کرتا ہوں واطرح غنچہ کے اب اپنا دہاں کرتا ہوں

(۴) حاتم (سال ولادت ۱۱۱۱ھ سال وفات ۱۱۹۷ھ) دیوان زادہ کے قلمی نسخے میں جو رام پور میں ہے ایک واسوخت موجود ہے، غلطی سے میں نے اس کا پہلا شعر نقل نہیں کیا۔"

آزاد نے سودا کے متعلق لکھا ہے کہ ۱۱۹۵ھ میں تقریباً ستر برس کی عمر میں انتقال کیا۔ گلِ رعنا میں بھی اسی کی تقلید کی گئی ہے۔ اس بنا پر سودا کا سال ولادت ۱۱۲۵ھ قرار پاتا ہے۔ غالباً اسی بنا پر ڈاکٹر بیلی نے بھی سودا کی پیدائش کا سال ۱۷۱۳ء (م ۱۱۲۵ھ) درج کیا ہے۔ لیکن یہ سب ظن و قیاس ہے۔ سودا کی پیدائش کا صحیح سال پردۂ خفا میں ہے معلوم نہیں کس بنا پر قاضی عبدالودود صاحب کا اصرار ہے کہ سودا ۱۱۱۵ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے تھے۔ مضمون کے حاشیہ میں انھوں نے لکھا ہے کہ یہ ان کی اپنی تحقیق ہے۔ اس سلسلہ میں ایک بات کھٹکتی ہے، عام طور پر مشہور ہے کہ سودا نے شاہ حاتم کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا تھا۔ آزاد کا بیان ہے کہ حاتم نے دیوان زادہ کے دیباچہ میں اپنے پینتالیس شاگردوں کا ذکر کیا ہے جن میں ایک سودا بھی ہیں۔ حاتم کا سال ولادت ۱۱۱۱ھ ہے۔ اب اگر سودا کا سال ولادت ۱۱۱۵ھ کے لگ بھگ قرار دیا جائے تو اس حساب سے حاتم سودا سے عمر میں صرف چار سال بڑے ٹھہرتے ہیں اور یہ بات خلاف قیاس ہے کہ سن کے قلیل تفاوت کے باوجود سودا جیسے زبردست شاعر نے حاتم سے اصلاح لی ہو۔ غرض حاتم کی استادی اور سودا کی شاگردی کی روایت صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ پھر بھی یہ بات تحقیق طلب ہے کہ سودا کس سن میں پیدا ہوئے تھے۔ جن حضرات کو اس قبیل کی تحقیقات کا شوق ہو اور موقع حاصل ہو اور قلمی و مطبوعہ ماخذ پر دسترس ہو تحقیق کی طرف متوجہ ہو کر قاضی صاحب کے بیان کی تصدیق یا تردید کریں، یہ ایک مفید کام ہوگا۔

قاضی صاحب نے حشمت کے واسوخت کا ذکر کیا ہے۔ میں کہہ چکا ہوں کہ قاضی صاحب نہایت اختصار پسند واقع ہوئے ہیں۔ وہ اپنے مضامین میں شعرا کا صرف تخلص درج کرنے پر اکتفا کرتے ہیں جس سے اکثر غلط فہمی واقع ہو جاتی ہے۔ تخلص کا یہ حال ہے کہ وہ کوئی مابہ الامتیاز چیز نہیں، کیونکہ ایک ایک تخلص کے کئی کئی شاعر ہوتے ہیں مثلاً اکبر الہ آبادی، اکبر داناپوری، اکبر میرٹھی، شوق قدوائی، شوق نیموی، شوق سندیلوی۔ نسیم دہلوی، نسیم لکھنوی، نسیم بھرتپوری۔ اس لئے نام کے ساتھ تخلص درج کرنا کا طریقہ زیادہ محفوظ و مستقیم ہے کہ اس سے اشتباہ و التباس واقع نہیں ہو سکتا۔ حاتم کے معاصرین میں حشمت تخلص کے دو شاعر

تھے، ایک محمد علی حشمت جو میر عبدالحی تاباں کے استاد تھے اور دوسرے محتشم علی خاں حشمت ۔ معلوم نہیں قاضی صاحب کی مراد محمد علی حشمت سے ہے یا محتشم علی خاں حشمت سے، اور حکیم صالح صاحب کی بیاض میں جو واسوخت درج ہے وہ اول الذکر کی تصنیف ہے یا ثانی الذکر کی۔ مولانا عبدالسلام ندوی شعر الہند میں لکھتے ہیں کہ "میر حسن نے بھی محتشم علی خاں حشمت کے مشہور واسوخت کا ایک بند جو اسی طرز (سودا کی طرز) میں ہے نقل کیا ہے :۔ " حاسداں تم کو جدا بیٹھ کے بہکاتے ہیں" میر حسن کا تذکرۂ شعرا میرے پاس موجود نہیں اس لئے میں نہیں کہہ سکتا کہ انھوں نے اُس واسوخت کو محمد علی حشمت کی تصنیف بتایا ہے یا محتشم علی خاں حشمت کی۔ قایم نے مخزن نکات میں دونوں کا ذکر کیا ہے لیکن محتشم علی خاں کی نسبت وہ لکھتے ہیں :۔ " از مردمان مشاہیر بود گاہ گاہ دو سہ شعر ریختہ و فارسی باکمال تازگی می گفت" اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ فارسی کے شاعر تھے اور اُردو میں کبھی کبھی دو تین شعر کہہ لیتے تھے۔ لہذا یہ بات تحقیق طلب ہے کہ جو واسوخت تذکرۂ میر حسن میں منقول ہے وہ کس حشمت کی ملک ہے۔

قاضی صاحب نے حشمت کا سال وفات ۱۱۶۳ھ لکھا ہے، معلوم نہیں کون حشمت، محمد علی یا محتشم علی خاں ؟ — اگر محمد علی حشمت مراد ہیں تو اُن کا سال وفات ۱۱۶۳ھ نہیں ہے بلکہ ۱۱۶۱ھ ہے۔ ثبوت میں اُن کے شاگرد رشید تاباں کے نوحۂ مخمس کا آخری بند ملاحظہ ہو :۔

تیرا تاباں غریب و خستہ جگر — فکر تاریخ میں تھا حد مضطر
مصرع آخری پہ کی جو نظر، — کد سے ہاتف نے اُسکو دی خبر
۲۴
ہائے حشمت شہید واویلا

۳۷ + ۱۱ × ۲۴ = ۱۱۶۱ھ

اور اگر حشمت سے محتشم علی خاں مراد ہیں تو بھی ان کی تاریخ وفات ۱۱۶۳ھ محل نظر اور محتاج ثبوت ہے۔ قایم نے مخزن نکات ۱۱۶۹ھ میں مرتب کیا (یہی تذکرہ کا تاریخی نام بھی ہے)۔ اس کتاب میں درج ہے "قبل ازیں ہفت سال بہ مرگ دفعتاً از جہاں رفت او تعالیٰ رحمتش کناد" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے انتقال کا تقریبی سال ۱۱۶۱ھ ہے نہ کہ ۱۱۶۳ھ۔

قاضی صاحب کا خیال ہے کہ تاباں کے مطبوعہ دیوان میں " ترکیب بند کے نام سے ایک واسوخت درج ہے" لیکن دیوان دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دو نظمیں اور بھی اسی قبیل کی ہیں جو تضمین کے عنوان سے چھپی ہیں اور ان نظموں کا انداز بھی واسوخت ہی کا ہے۔ میں دونوں نظموں کا ایک ایک بند پیش کرتا ہوں :۔

(۱) میں تیرے عشق سے از بسکہ کفر میں آیا — طریق مسجد و بت خانہ ایک سا بوجھا
تمام خلق نے مشہور ملحدوں میں کیا — دیا ہے قتل کا قاضی نے بھی مرے فتویٰ
بہ جرم عشق توام میکشند و غوغائے ست — تو نیز بر سرِ بام آ کہ خوش تماشائے ست

(۲) نازک اندام تجھے دیکھ ہوا میں مفتوں عقل اور ہوش کو کھو نام رکھا یا مجنوں،
زور رکھتی ہے ترے برمیں قبائے گلگوں اس کے تئیں جھوٹ تو مت جان میں سچ کہتا ہوں

شمع گر با تو کند دعوئے نازک بدنی
کشتنی سوختنی باشد و گردن زدنی

قاضی صاحب فرماتے ہیں کہ "آزاد کا دعویٰ ہے کہ اُردو میں پہلا واسوخت میر تقی میر نے لکھا ہے۔ لیکن انھوں نے یہ نہیں بتایا کہ جب ایسے شاعروں کے واسوخت موجود ہیں جن کی شاعری کا آغاز میر کی شاعری سے پہلے ہو چکا تھا تو میر کے واسوخت کو زمانی حیثیت سے مقدم سمجھنے کی کیا وجہ ہے۔"

اُردو شعرا میں ایک بڑا نقص یہ ہے کہ وہ اپنی نظموں کا سال تصنیف نہیں درج کرتے، اس لئے یہ بات معلوم کرنا تقریباً ناممکن ہے کہ کون غزل یا کون نظم کس سن میں لکھی گئی۔ قاضی صاحب کا خیال ہے کہ چونکہ میر کے دوسرے واسوخت کا پہلا شعر (سچ کہو شہر میں) میر حسن کے تذکرے میں نقل کیا گیا ہے اور یہ تذکرہ ۱۱۸۶ھ اور ۱۱۹۲ھ کے مابین لکھا گیا ہے اس لئے اس واسوخت کے زمانۂ تصنیف کی آخری حد متعین ہو جاتی ہے۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ اولیں حد تو متعین نہیں ہوئی۔ یہ کیونکر مانا جائے کہ یہ واسوخت ۱۱۸۶ھ سے کچھ ہی پہلے لکھا گیا۔ میر ایک فطری و وہبی شاعر تھے، انھوں نے یقیناً بچپن ہی سے شعر کہنا شروع کر دیا ہوگا۔ اگر میر کی ولادت ۱۱۲۵ھ میں ہوئی تو کیا یہ ممکن نہیں کہ انھوں نے بیس پچیس ہی سال کی عمر میں واسوخت لکھا ہو اور دوسرے شعرا نے جو میر سے بیس پچیس برس بڑے بھی ہوں ان کی تقلید کی ہو۔ حاتم، حشمت، تاباں اور سودا میر سے عمر میں یقیناً بڑے تھے لیکن اس بات کا امکان موجود ہے کہ پہلے میر نے واسوخت لکھا ہو اور ان شعرا نے ان کی تقلید کی ہو۔ یہ کوئی عیب کی بات نہیں کہ ایک سن شاعر ایک کمسن شاعر کے تتبع میں کوئی نظم لکھے۔ حاتم عمر میں انعام اللہ خاں یقین سے تقریباً بیس پچیس سال بڑے تھے، مگر انھوں نے یقین کی کئی غزلوں پر غزلیں لکھیں۔ راسخ عظیم آبادی آتش سے سن میں بڑے تھے، لیکن انھوں نے آتش کی ایک غزل پر تضمین کی۔ حافظ فضل حق آزاد عظیم آبادی سراقبال سے عمر میں بڑے تھے مگر انھوں نے آخر عمر میں اقبال کی غزلوں پر غزلیں لکھیں اور ان کے تتبع میں جدید رنگ کی متعدد نظمیں بھی لکھیں۔ لہٰذا یہ بات کوئی مستبعد یا ناممکن نہیں کہ میر نے واسوخت کی ابتدا کی ہو اور حاتم، حشمت، تاباں اور سودا نے ان کی تقلید کی ہو۔ میں صرف امکان سے بحث کر رہا ہوں، ثبوت نہیں دے سکتا۔ زمانی حیثیت سے مؤخر ہونے کی بنا پر یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ میر نے حاتم وغیرہ کے بعد واسوخت لکھا جب تک کہ قطعی ثبوت نہ مل جائے۔ اتنی بات تو قاضی صاحب بھی مانتے ہیں کہ "عجب نہیں کہ میر پہلے شاعر ہوں جس نے واسوخت مسدس کی شکل میں لکھا ہے" کیونکہ حاتم وغیرہ کے واسوختوں کے ہر بند میں چھ کے بجائے آٹھ مصرعے ہیں۔

اب رہ گئے شاہ مبارک آبرو۔ آبرو کا واسوخت حکیم صالح صاحب کی ایک قلمی بیاض میں پایا جاتا ہے۔ قاضی صاحب کا بیان ہے کہ یہ بیاض کچھ کم دو سو سال کی لکھی ہوئی ہے (غالباً ۱۱۴۰ھ اور ۱۱۷۰ھ کے مابین لکھی گئی ہوگی) اور اس بیاض

میں ایک اور واسوخت "سوز و گداز" کے عنوان سے کسی نامعلوم شاعر کا لکھا ہوا ہے جو حاتم اور آبرو کا معاصر معلوم ہوتا ہے، اس کا پہلا شعر یہ ہے :-

دوستاں شرح مرے حال پریشانی کی گوش کرنا یہ حکایت .....[1] ہجرانی کی

معلوم نہیں یہ واسوخت کس شاعر کا ہے اور یہ شاعر کس زمانہ میں تھا۔ اہلِ ذوق حضرات اس کی تفتیش کریں تو بہتر ہے۔ بہرکیف آبرو کے واسوخت کے متعلق مزید تحقیق کی ضرورت ہے کیونکہ قاضی صاحب کے قول کے مطابق آبرو کے دیوان کے دو نسخوں میں یہ واسوخت موجود نہیں۔ بہرحال اگر یہ واسوخت فی الواقع آبرو ہی کی کاوشِ فکر کا نتیجہ ہے تو انھیں کو واسوخت کا موجد ماننا پڑے گا۔ تاہم یہ بات مسلم ہے کہ مسدس کی شکل میں سب سے پہلے میر ہی نے واسوخت لکھا۔

قاضی صاحب آخر میں فرماتے ہیں کہ "یہ بیاض جا بجا سے کرم خوردہ ہے اور اس میں اغلاط کتابت بھی بہ کثرت ہیں مزید یہ کہ صاحب بیاض نے صریحاً واسوخت کو نامکمل نقل کیا ہے۔ آخری شعر کے بعد بیاض میں سادہ جگہ چھوٹی ہوئی ہے۔ افسوس ہے کہ دوسری بیاض سے (یہ واسوخت ایک اور قلمی بیاض میں بھی موجود ہے) مقابلے کی کوئی صورت اس وقت نہ نکل سکی۔"

قاضی صاحب کی تحقیق لایق ستایش ہے لیکن ضرورت ہے کہ کوئی صاحب ذوق مزید تحقیق کر کے اس واسوخت پر کچھ روشنی ڈالیں۔ چونکہ معاصر قلیل الاشاعت رسالہ تھا اور اس کی اشاعت عموماً صرف کالجوں تک محدود تھی اور نگار ایک قدیم اور کثیر الاشاعت رسالہ ہے اس لئے مناسب اور ضروری سمجھتا ہوں کہ آبرو کے واسوخت کو نقل کر دوں تاکہ لوگوں کو اس کا علم ہو جائے اور مزید تحقیق کی کوئی صورت نکل سکے۔

(۱) یارب اب حال مرا صبر سے در گزرا ہے دل مرا صبر جو کرتا تھا سو کر گزرا ہے
سر کو شمشیر تلے ظلم کے دھر گزرا ہے دن قیامت سوں ترے ہجر کے بھر گزرا ہے
جیوتے جان کفن غم سوں پہر گزرا ہے بلکہ سو بار ترے واسطے مر گزرا ہے
اب نہیں تاب مجھے اشک سوں چپ رہنے کی ..... ظلم و ستم سہنے کی

(۲) روز اول کہ ترا کوئی خریدار نہ تھا ..... یہ چرچا شور بہ بازار نہ تھا
کسی کو زلف تری سوں یہ سروکار نہ تھا کسی کے دل منے اے یار ترا پیار نہ تھا
تیری نرگس کے کوئی شوق سوں بیمار نہ تھا .....
اک ہمیں تھے کہ کبھی تجھ پہ نظر کرتے تھے گاہ گاہ ترے کوچہ میں گزر کرتے تھے

---

[1] یہ جگہ کرم خوردہ ہے شاید "غمِ ہجرانی" ہو۔ ولی

(۳) شوق نے دل کے ہمارے تجھے معشوق کیا، ہو کے مشتاق ترارے تجھے معشوق کیا
نار کی طرح پیارے تجھے معشوق کیا بوجھ تو کن نے پیارے تجھے معشوق کیا
سب طرح تجھ کو سکھائی تجھے معشوق کیا کیا برا تیرا کیا رے تجھے معشوق کیا
نہیں اور تجھسے کے خوار پڑے پھرتے تھے بر سر کوچہ و بازار پڑے پھرتے تھے

(۴) دل میں تو بوجھ اول کن نے تجھے پیار کیا جیو کو دے ہاتھ ترے کن تجھے دل دار کیا،
کس کی نظروں کے سبب حسن و انکار کیا تری کن نے تجھے دل دار کیا
باغباں ہو کے کنے تجھکو چمن زار کیا کن کھلا کر کے تجھے حسن کا گلزار کیا
اب تجھے شوق ہوا غیر سوں جا ملنے کا اب تو بھر اور سے ہر وقت مزہ ملنے کا

(۵) رات کو دیکھ کے اے یار ترے طور مجھے اپنے احوال کے دل بیچ ہوا غور مجھے
یاد ہے وہ ترے سب ظلم و ستم جور مجھے غم نے آ گھر کیا اے جان برے دور مجھے
جیو میں بھی آیا تھا اُسوقت میں کچھ اور مجھے ایک اک پند کہ آتا تھا بھی فی الفور مجھے
ایسے اک بند کو میں ورد زباں کرتا ہوں، پڑھ کے پھر بھی اسی اک بند کو میں مرتا ہوں

(۶) آہ افسوس مرا یار مجھے بھول گیا غیر سے مل کے ستمگار مرا بھول گیا
جان اور بوجھ کے اب حال مرا بھول گیا درد اور شوق اور آزار مرا بھول گیا
محنت و رنج کا بستار مرا بھول گیا آہ یہ حال اُسے یک بار مرا بھول گیا
جیو میں آتا ہے کہ اُس یار سوں جا کر رہئے یاد میں کھو دا سی شرم سوں جا گڑ رہئے

(۷) ہم جو جب پاس تمھارے اے سجن آتے تھے دیکھ کر ہم کو گویا جان سا تم پاتے تھے
جوں نہ آتے تھے کبھی آپ بلواتے تھے دیر کرتے تھے تو لے آپ کو پہنچاتے تھے
بیٹھ کر پاس ہمیں پیار سے پھسلاتے تھے ہر طرح ساتھ منا کر بھی لے جاتے تھے
منتیں کر کے نہیں چھوڑتے تھے راتوں کو اک گھڑی بیٹھ کے کہتے تھے سجن باتوں کو

(۸) اب وہ اخلاص محبت کی طرح بھول گئے چھپ کے ملنے کی وہ خلوت کی طرح بھول گئے
ہم نشینی کی وہ صحبت کی طرح بھول گئے پیار کی ناز کی الفت کی طرح بھول گئے
مہربانی کی وہ شفقت کی طرح بھول گئے غیر سوں مل کے محبت کی طرح بھول گئے
اب وہ انکھیاں ترے لے یار وہ ابرو بھی نہیں وہ جو اخلاص تھا دل کا کہیں اب بو بھی نہیں

(۹) جان جاتے ہو نہ تم ہم ستی بے دل جاؤ گرچہ جانا ہے ضروری تو گلے مل جاؤ

# دُنیا کے مہاجرین

تارکینِ وطن کا مسئلہ ہندوستان اور پاکستان دونوں کے لئے نیا ہو، لیکن یورپ اور مشرق وسطیٰ یورپ کے لئے نیا نہیں۔ یہودی مصر سے نکالے جانے کے بعد آج تک مہاجرین کی حیثیت رکھتے ہیں اور اہلِ یورپ کی ہجرت کی تاریخ اسی وقت سے شروع ہوتی ہے جب وہاں کی سائنسی دور تہذیب نے غلط راستہ اختیار کر کے استعماریت کی بنیاد ڈالی اور حکومتوں نے ایک دوسرے کو باہر نکالنے کی کوشش شروع کی۔ لیکن مہاجرین کا مسئلہ اپنی پوری شدت کے ساتھ پہلی جنگ عظیم کے بعد سامنے آیا کیونکہ اس نے متعدد حکومتوں کا تختہ الٹ دیا اور وہاں کی آبادیوں کو خانماں برباد ہو کر اپنا وطن چھوڑنا پڑا۔

ذیل کے نقشہ سے آپ کو مختلف ممالک کے مہاجرین کی تعداد کا اندازہ ہو سکے گا۔

روس = ۱۹۲۲ء میں = ۱۷ اور ۷۲ لاکھ کے درمیان

۱۹۳۰ء میں = ۵ اور ساڑھے ۵ لاکھ کے درمیان

۱۹۳۶ء میں = ساڑھے تین لاکھ سے زاید اور اگر اس میں مشرق بعید کے روسی مہاجرین بھی شامل کئے جائیں تو ساڑھے چار لاکھ سمجھئے۔

آرمینیا = ۱۹۲۴ء میں = ۲ لاکھ ۵ ہزار

۱۹۳۰ء میں = ۲ لاکھ ۱۰ ہزار

۱۹۳۶ء میں = ۲ لاکھ ۲۵ ہزار۔ ان میں سے تقریباً ایک لاکھ ۳۴ ہزار نے شام اور لبنان میں سکونت اختیار کر لی

اسپین = ۳۹ء میں = ۴ لاکھ۔

اٹلی = ۳۹ء میں = ایک لاکھ ۸۰ ہزار

جرمنی = ۳۸ء میں = ۳ لاکھ ۵۰ ہزار

دوسری لڑائی کے بعد دنیا کے تقریباً ۸۰ لاکھ انسانوں کو ترک وطن کرنا پڑا۔

۱۹۴۵ء میں متحدہ اقوام نے مہاجرین کے بسانے کے لئے ایک اسوسی ایشن قایم کی، اس نے مہاجرین کی امداد پر ۳۶۸۳۵۸۲۲۳۹ ڈالر خرچ کئے۔

غذا پر اور دوسری ضروریات پر = ۲۹۷۵۱۳۴۹۹۵ ڈالر

کپڑوں پر = ۱۹۰۷۴۰۰۰ ڈالر

دواؤں پر = ۱۱۶۲۲۹ ڈالر

نقل و حمل اور اسٹاف = ۵۹۷۷۲۱۰۷۴ ڈالر

۳۰ جون ۱۹۴۷ء کو جب یہ اسوسی ایشن ختم ہوئی تو اس کی امداد کا اندازہ یہ تھا:۔

| | | | |
|---|---|---|---|
| جرمنی میں | = | ۲۳۰۵۹ | مہاجرین |
| آسٹریا میں | = | ۱۷۹۸۳ | " |
| اٹلی میں | = | ۲۷۷۰۵ | " |
| وسطی شرقی یورپ میں | = | ۲۷۷۰۵ | " |
| چین میں | = | ۱۰۱۴۹ | " |

پہلی جولائی ۱۹۴۷ء کو اس ادارہ کا انتظام بین الاقوامی تارکین وطن کی انجمن نے اپنے ہاتھ میں لے لیا اور جب اس نے امداد کا اعلان کیا تو ۱۶ لاکھ درخواستیں اسے موصول ہوئیں ـــ پہلی جولائی ۱۹۴۷ء سے ۳۰ ستمبر ۱۹۴۹ء تک اس نے ۷ لاکھ مہاجرین کو دوبارہ بسایا، ۶۷ ہزار کو ان کے وطن واپس کیا، ۱۰ لاکھ سے زیادہ کے عارضی قیام کے لئے کیمپ بنائے اور ۶۲۲۰۰۰ مہاجرین کو ریل اور جہازوں کے ذریعہ سے ۸۰ ملکوں میں پہونچایا ـــ لیکن اسی زمانہ میں مہاجرین کی تعداد اور بڑھتی گئی۔ کیونکہ چین میں ۴۰ شہر برباد ہوئے اور وہاں کی ایک کروڑ آبادی خانماں برباد ہوگئی۔

ہندوستان میں تقسیم کے بعد ہندوستان و پاکستان میں تقریباً ایک کروڑ آدمی ترک وطن پہ مجبور ہوئے۔

یہودیوں کی حکومت اسرائیل فلسطین میں قایم ہوئی تو دس لاکھ عربوں کو ہجرت کرنا پڑی۔

انگلو امریکن بلاک اور روسی بلاک نے یورپ کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے اور ۱۵ لاکھ آدمیوں کو مشرقی بلاک سے مغربی بلاک کی طرف ہجرت کرنا پڑی۔ برما، ملایا، انڈونیشیا کے تارکین وطن کی صحیح تعداد کا حال معلوم نہیں، لیکن یقینی ہے کہ وہاں بھی انکی تعداد بہت زیادہ ہے ـــ ۳۰ ستمبر ۱۹۴۹ء تک (۲۷ مہینوں میں) بین الاقوامی تارکین وطن کے ادارہ نے تقریباً ۶۲۲۰۰۰ مہاجرین کی مدد کی۔ ان میں سے ۱۱۸۶۲۰ یونائیٹڈ اسٹیٹس میں دوبارہ آباد کئے گئے اور ۱۱۴۱۱۹ یہودی حکومت اسرائیل میں بسائے گئے۔ ۸۲۷۲۵ برطانیہ میں، ۸۰۷۵۱ کناڈا میں، ۳۶۵۲۵ فرانس میں، ۲۷۲۵۵ ارجنٹائن میں، ۲۲۲۰۵ برازیل میں، ۲۲۱۰۶ بلجیم میں، ۱۲۳۴۳ وینزویلا میں اور ۳۲۲۴۱ دوسرے ملکوں میں آباد کئے گئے۔

خیال کیا جاتا ہے کہ ۱۹۵۱ء کے اخیر تک، ۳۵۰۰۰ مہاجرین کو اور آباد کیا جائے گا اور اس طرح پانچ سال میں زیادہ سے زیادہ ایک لاکھ تارکین وطن کو بسایا جاسکے گا۔ اس میں چین، انڈونیشیا، برما، انڈوچائنا، ہندوستان، پاکستان، فلسطین، یونان اور اُن دوسرے ملکوں کے مہاجرین شامل نہیں ہیں جن کا تعلق اس ادارہ سے نہیں ہے۔

# آرٹ کی ماہیت اور آغاز

آرٹ زندگی اور کائنات سے متعلق انسانی تجربات کا حسین اظہار ہے۔ زندگی کی جدوجہد میں آرٹ کی ابتدا جمالیاتی احساس کے بڑھتے ہوئے شعور کے ساتھ ہوئی ہے۔ لیکن آرٹ کی دُنیا ہماری آپ کی دنیا کا عکس ہوتے ہوئے بھی کچھ نئی معلوم ہوتی ہے۔ ہماری خارجی اور باطنی زندگی کے مراحل سے گزر کر، زندگی کے مختلف تقاضوں سے اکتساب حرارت کرتے ہوئے آرٹ ہمیں جن کیفیتوں سے آشنا کرتا ہے وہ ہمارے علم اور تجربے کی حدوں میں ہوتے ہوئے بھی بہت کچھ نئی ہیں۔ اس لئے کہ اگرچہ آرٹ میں ہمیں زندگی کی عام حقیقتوں سے سابقہ پڑتا ہے لیکن انسانی ذہن کا تخلیقی عمل انھیں تراش کر نئی نئی شکلوں میں ڈھالتا رہتا ہے اور انفرادی تجربے کی تازگی اور گہرائی انھیں نئی معنویت اور توانائی عطا کرتی ہے۔ اس لحاظ سے فنی تجربہ فطرت سے مستعار ہوتے ہوئے بھی بلند تر معنویت کا حامل ہے اور اسی لئے آرٹ کو عام تنقیدی نظریے کے مطابق محض زندگی کی تنقید یا تعبیر نہیں کہا جا سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ فنی تجربے کی جڑیں زمان و مکان کی گہرائیوں میں پیوست ہیں لیکن فنی تخلیق ایک نئی اور بہتر حقیقت کی دریافت ہے۔

زندگی کے اعلیٰ تجربے کی حیثیت سے آرٹ کا وجود فنکار سے سنجیدگی اور گہرائی کا تقاضا کرتا ہے وہ سنجیدگی اور گہرائی جسمیں ساری کائنات فنکار کے ذہن کے لئے خام مواد بن جاتی ہے جس سے وہ حسیاتی پیکر تراشتا ہے۔ اس لمحہ موضوع کے تاثرات فنکار کے شعور کی گہرائیوں میں جذب ہو جاتے ہیں اور تخلیقی جذبہ بن کر اُبھرتے ہیں۔ اسی لئے تخلیق کے اس لمحے میں صدیوں کے تجربات زندگی جھلکنے لگتے ہیں۔

آرٹ کا موضوعِ بیان ہمیشہ انسان رہا ہے۔ اگرچہ ٹرنر ( Turner ) کا قلم اور ورڈ زورتھ ( Wordsworth ) کی شاعری اکثر مقامات پر عالمِ فطرت کو پیش کرتی ہے۔ لیکن اگر ہم غور کریں تو خالص فطرت کے نظاروں میں بھی ہمیں انسانی تجربۂ حیات کے کسی خاص لمحے یا کسی خاص ذہنی کیفیت کی جھلک مل جائے گی۔ اس لحاظ سے فن خواہ خارجی حقایق کی ترجمانی کرے یا داخلی کیفیات کو پیش کرے، بہر حال انسانی زندگی سے متعلق رہتا ہے اور اس لحاظ سے انسانی امنگوں، آرزوؤں اور حسرتوں کا کسی نہ کسی جہت سے ترجمان بن جاتا ہے۔ وہ فنکار جو کسی نقطۂ نظر کے تابع نہیں ہیں اور زندگی کو جس صورت میں دیکھتے ہیں، پیش کر دینے کے حامی ہیں ان کے یہاں بھی کسی نقطۂ نظر کی کارفرمائی ملجاتی ہے۔ اس لحاظ سے خارجیت نگاری بھی ایک نقطۂ نظر بن جاتی ہے جو زندگی کی موجودہ صورت کو بدلنا نہیں چاہتی بلکہ اسے

اسی طرح قایم رکھنے کی قایل ہے۔ لیکن یہ خارجیت نگاری اپنے حدود میں بھی بے لاگ نہیں رہنے پاتی اور اس میں جگہ جگہ ذاتی رجحان کی جھلک مل جاتی ہے۔ زندگی کی ساری داستان سے چند ٹکڑوں کا انتخاب ہی اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ فنکار نے کچھ چیزوں کو بیان کرنے کے قابل پاکر چن لیا ہے اور باقی کو غیر اہم جان کر چھوڑ دیا ہے لیکن جہاں اہمیت کا سوال آجائے وہیں یہ بات بھی ظاہر ہو جاتی ہے کہ جب تک فنکار کے ذہن میں اہم یا غیر اہم کا کوئی مفہوم متعین نہ ہو یعنی وہ زندگی کی بعض قدروں کو دوسری قدروں کے مقابلہ میں زیادہ عزیز نہ رکھتا ہو اس وقت تک وہ اس سلسلہ میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔ یہ ضروری نہیں کہ فنکار نے شعوری طور پر ان قدروں کو سمجھا ہو اور اپنے نقطۂ نظر سے خود بھی باخبر ہو۔ لیکن دانستہ یا غیر دانستہ اسکا نقطۂ نظر اس کی ذہنی تخلیقات پر اثر انداز ہوتا رہتا ہے۔ ایمل زولا (Emil Zola) اور نظیر اکبر آبادی جیسے بڑے خارجیت نگار بھی اپنے فن پاروں کو ذاتی احساسات سے غیر متعلق نہیں رکھ سکے ہیں۔ ایمل زولا کی خارجیت نگاری کم از کم اس کی دو ناولوں "The Dream" اور "Abbe Mouret's Transgression" میں مدہم ہو کر صرف اندازِ بیان کی حد تک باقی رہ گئی ہے۔ لیکن موضوع کی دل آویزی اور رنگینی میں صاف اس کے نقطۂ نظر یا افتادِ طبع کی جھلک ملتی ہے۔ اسی طرح نظیر اکبر آبادی کی شاعری کی دنیا میں جو انسان سانس لیتا ہوا محسوس ہوتا ہے وہ اپنے دور کی اجتماعی زندگی کے تمام ہنگاموں میں شریک ہونے کے باوجود منفرد ذہن رکھتا ہے اور اپنے گرد و پیش کا اسی انفرادی انداز میں جایزہ لیتا ہے۔ اسی داخلی احساس کی شعوری لے کبھی تیز ہو کر فنکار کو خارج سے بے نیاز بھی کر دیتی ہے۔

مادر پیالہ عکسِ رخِ یار دیدہ ایم
اے بے خبر زلذتِ شربِ مدام ما (حافظ)

ایں جہاں چیست صنم خانۂ پندار من است — جلوۂ او گردِ دیدۂ بیدار من است
ہستی و نیستی از دیدن و نادیدنِ من، — چہ زمان و چہ مکاں شوخیِ افکار من است (اقبال)

کہاں کا میخانہ کس کا ساقی کچھ اور بڑھنے دو بے خودی کو — یہی بنائے گی جام و ساغر یہی کرے گی شراب پیدا (جگر)

حقیقت یہ ہے کہ فطرت اور خارجی حقایق انسانی ذہن میں بجنسہ منعکس نہیں ہوتے ہیں۔ گزرے ہوئے پچھلے واقعات کے نقوش، ماثل تصورات، حال کی کیفیتوں اور ملتی جلتی ذہنی تصویروں کے علاوہ زندگی کی طویل راہوں میں آغازِ حیات سے لے کر حال تک جو نشانات ملتے ہیں وہ بھی فطرت سے حاصل کردہ تاثرات کو اپنے رنگ میں رنگ لیتے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ فطرت اور خارجی حقایق سے انکار کر دیا جائے، یا انھیں محض داخلی ذہن کا کرشمہ سمجھ لیا جائے۔ انکا وجود اپنی جگہ اٹل حقیقت ہے اور اگر ہم انسان کی تمدنی زندگی کی ابتدا اور فنون لطیفہ کے آغاز پر غور کریں تو ہم پر کھل جائے کہ دراصل ہمارے شعور کی پروان بھی خارجی حقایق اور عالمِ فطرت کے آغوش میں ہوئی ہے۔ اس لئے آج بھی فطرت کے مظاہر ہمارے جذباتی تصورات کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں۔ بائرن (Byron) کہتا ہے کہ میں صرف میں

نہیں رہتا ہوں بلکہ اپنے گردوپیش کا جزو بن جاتا ہوں اور میرے لئے اونچے پہاڑ بھی جذبات کا کام کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فطرت فنکار کے لئے ہمیشہ ایک اہم اور وسیع موضوع رہی ہے۔ لیکن آرٹ میں فطرت کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمیں اس حقیقت کو سمجھ لینا ہے کہ مشاہدۂ فطرت میں مشاہد کی شخصیت بھی کارفرما ہے جس کے بالواسطہ نظام سے فطرت اثر قبول کرتی ہے۔ اسی حقیقت کو حال کی ایک شاعرہ Alice Meynell نے اپنی ایک نظم "To any poet" میں بڑی خوبی سے بیان کیا ہے۔ وہ شاعر سے مخاطب ہو کر کہتی ہے:۔

Singthy sorrow, Sing the gladness
In thy songs must wind and tree
Bear the fictions of thy sadness
Thy humanity

فطرت اور فنکار کی وابستگی بہت قدیم ہے۔ فن محض انفرادی تجربہ نہیں ہے۔ اس میں سماج اور فطرت کی جلوہ گری کے علاوہ ہزارہا سال کی انسانی زندگی کے نقوش بھی قدم قدم پر ملتے ہیں۔ اس آئینہ خانہ میں انسانوں کی تہذیبی زندگی کلچرل روایات، معاشرتی تعلقات اور معاشی حقیقتیں عکس فگن نظر آتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ انسانی تہذیب کی پہلی جھلک بھی ہمیں فنونِ لطیفہ کی کرنوں سے منور نظر آتی ہے اور زندگی کے گرد آرٹ کی قوس قزح رنگ و نور کا طوفان لئے ہوئے ہے لیکن اس کی ابتدا، قبل تاریخ کے دھندلکوں میں کھوئی ہوئی ہے اور اسے سمجھنے کے لئے ہمیں انسانوں کی ابتدائی معاشرت کا جایزہ لئے بغیر چارۂ کار نہیں ہے۔

ذہنِ انسانی اپنے ارتقائی سفر کے دوران میں تہذیب کی بہت سی منزلوں سے گزرا ہے اور اس نے اکثر روایت کی گھنی چھاؤں میں دم لے کر آگے بڑھنے کی نئی طاقت کا احساس بھی کیا ہے۔ اس لحاظ سے انسانی زندگی ایک تجربہ ہے مسلسل اور غیر منقطع ——— جس کا رشتہ بقائے حیات کی اولین کوششوں سے قایم کیا جا سکتا ہے۔ دراصل اس کرۂ ارض پر انسان کی پیدایش فطرت کی معجزانہ صلاحیتوں کا ثبوت ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا تکمیل کی جانب پہلا قدم بھی ہے اور انسانی زندگی نے زمانۂ قبل تاریخ سے آج تک جو منزلیں طے کی ہیں ان کے خوشگوار اجالے میں ہم صدیوں کی تہذیب کا رقص دیکھ سکتے ہیں۔ تاریخ کے تال اور آہنگ پر رقص کرتے ہوئے اکثر زندگی نے اپنے چہرے سے نقاب الٹ دی ہے اور اسکے حسنِ بے حجاب کی کارفرمائیوں نے جس طرح دورِ وحشت یا قدیم و جدید پتھر اور دھات کے انسانوں کو اپنا والہ و شیدا بنایا ہے اسی طرح آج مشینوں کے دھوئیں سے سیہ پوش محفل کو بھی جگمگایا ہے اور تابانی بخشی ہے۔ وہ مقام جہاں زندگی کے چہرے سے نقاب سرک جاتا ہے اور اس کے حسنِ بے باک کی نورافشانی میں کوئی حجاب مانع نہیں رہتا، آرٹ کی جلوہ گاہ ہے اور یہاں زندگی گردشِ چشم کے اشارے پر زمین اپنی گردشیں سمیٹ لیتی ہے، زمان و مکان کی طنابیں کھنچ جاتی ہیں اور حیات و

کائنات ایک نقطہ پر سمٹ آتی ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ انسانوں نے پہلی بار جب چند کھینچی ہوئی لکیروں، جسم کی کچھ مسلسل حرکتوں اور آوازوں کے اُتار چڑھاؤ کے مجموعوں میں تناسب اور توازن کے ساتھ ساتھ اپنی زندگی کی کسی محسوس حقیقت کی جھلک دیکھی ہوگی تو دم بخود رہ گئے ہوں گے اور اسے کسی عظیم و پر ہیبت طاقت کا پرتو سمجھ کر سر جھکا دئے ہوں گے۔ اسی لئے قدیم انسان کا احساس جمال ٹونے ٹوٹکے اور جادو کے تصورات و توہمات کا پابند رہا تھا۔ چنانچہ قدیم انسان جہاں ہمیں ایک جانب فطرت کی عظیم طاقتوں کے سامنے سربسجود ملتا ہے وہاں اس کے آرٹ میں بھی ہمیں مافوق الفطرت عناصر سے سابقہ پڑتا ہے جنھیں خیر و شر اور رحم و غضب کے پیکر سمجھ کر وہ کبھی مدد کا خواہاں ہوتا ہے اور کبھی رحم کا طالب۔ اس طرح انسان کے ان فوق الفطری تصورات میں ہمیں اس کے تخیل کی کارفرمائی صاف طور پر نظر آتی ہے۔ دراصل اس کے جسم کی ساخت نے جہاں اسے خطرات سے بھری دنیا میں غیر محفوظ چھوڑ دیا تھا وہاں اسے عقل کا استعمال بھی سکھایا تھا اور اس کے تخیل کی جولانگاہوں کے لئے بھی وسیع میدان فراہم کیا تھا۔ پھر اس کے دونوں ٹانگوں کے بل سیدھے کھڑے ہونے اور ہاتھوں کے آزاد رہنے کی وجہ سے نہ صرف اسے زندگی کی جدوجہد میں مدد ملی بلکہ اسکا ذہن گردوپیش کا جایزہ لے کر مختلف نتایج اخذ کر سکا اور ان نتائج کو بیان کرنے کے لئے ہر لحظہ ترقی پاتی ہوئی آوازوں کا سہارا لیا گیا جس نے آخرکار زبان کی شکل اختیار کر لی۔ اس طرح زبان ایک سماجی ورثہ بن جاتی ہے جو نسلاً بعد نسلٍ نوع انسانی میں منتقل ہوتا اور ترقی پاتا رہا ہے۔ اس کے علاوہ زبان جہاں سماجی ضرورتوں کی ترجمانی کرتی ہے وہاں رقص، موسیقی، مصوری اور بت گری کے پہلو بہ پہلو انسان کے جمالیاتی احساس کا اظہار بھی ہے۔ اسی کی مدد سے اس نے اپنی فتحمندی کے گیت گائے، فطرت کی وحشی طاقتوں کو رام کرنے کے منصوبے سوچے اور دل کی دھڑکنوں کو وسیع و بے کراں فضاؤں میں منتشر کیا۔

وقت آہستہ خرامی سے گزرتا گیا اور رفتہ رفتہ دجلہ و فرات کی وادی اور ہڑپا، موہن جوداڑو کے میدانوں میں دریائے نیل کے کنارے کنارے اور یونان، مصر، و بازنطینیہ کی آبادیوں میں شورشِ حیات کا نغمہ گونج اُٹھا۔ ان محفلوں میں زندگی کے مغنی نے آرٹ کے جو گیت گائے ہیں ان میں انفرادی دھڑکنوں کے ساتھ ساتھ اس وسیع کائنات کی تھرتھراہٹ بھی شامل ہے۔ اس لئے ان گیتوں میں معاشرت کی سادگی اور احساس کی معصومیت کے ساتھ ساتھ آسمانوں کی بلندی، مرغزاروں کی شادابی اور آبشاروں کا ترنم بھی ملتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسانی ذہن نے روز آغاز ہی سے فطرت کے نرم و نازک جلووں اور اسکے ہیبت ناک و پر عظمت مظاہر سے حسن و جمال کا درس لیا ہے اور اس کا احساسِ جمال فطرت کی رعنائیوں اور عظمتوں سے وابستہ رہا ہے۔ اس نے بادل کو بدلتے ہوئے رنگوں اور تبدیل ہوتی ہوئی حالتوں میں دیکھا ہے، سمندر کے جوش میں آنے کا مشاہدہ کیا ہے اور اسے طوفانوں کے جلال کا اندازہ ہے۔ اسی طرح پہاڑوں کی برفانی چوٹیوں، ہرے بھرے گھاس کے میدانوں اور ریگ زاروں کے غیظ اور سناٹے میں جو ہزارہا کیفیتیں پوشیدہ ہیں انسانی ذہن کبھی ان سے بیگانہ نہیں رہ سکا ہے۔ اس لئے یہ سوال بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ ہمارا جمالیاتی احساس گلیشیا ایک نفسی تجربہ ہے یا اس کا دور و نزدیک پھیلی ہوئی کائنات سے بھی کوئی علاقہ ہے؟۔

حقیقت یہ ہے کہ کائنات کی دلکشی دیکھنے والی نظروں کو ازل سے اپنے دام میں گرفتار کرتی رہی ہے۔ چنانچہ صبح کی زرنگار سرخی شام کے سرمئی دھندلکے اور شب کی پراسرار تیرگی نے انسانی ذہن پر ہمیشہ جادو سا کیا ہے۔ اکثر تاروں بھری رات کی خموشیوں اور چاندی کے سیلاب میں اس نے فضاؤں سے سرگوشیاں کی ہیں۔ ان دھیمی اور مدھم سرگوشیوں نے آرٹ کے مختلف روپ بدلے اور اپنے لافانی احساس میں آخر کار دوسروں کو بھی شریک کر لیا۔

اپنی مختلف خارجی شکلوں میں آرٹ نے ایک سماجی حیثیت اختیار کر لی۔ اس طرح تمدن کی ان ابتدائی منزلوں میں جہاں تاریخ کے قدم بھی لڑکھڑانے لگتے ہیں، شکار کے بعد کے جلسوں، کھلیان بھرے جانے کی خوشی میں رقص و سرود کی محفلوں اور رات کو الاؤ کے گرد جگھٹوں میں فنونِ لطیفہ کا آغاز ہوتا ہے۔ لیکن یہ آرٹ توہمات کے چھائے ہوئے بادلوں کے باوجود کھلی فضاؤں اور سورج کی جاں بخش کرنوں کی ضیاؤں سے قریب تر ہے اس لئے اس آرٹ میں فطرت کی ساری دل کشی اور رعنائی گھل ملجاتی ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ رگوید مقدس کے گیتوں اور زبور کے سہانے نغموں کو چمکتے سورج کا سونا اور بہتے دریا کی چاندی تابانی بخشتی ہے۔

قدیم انسان کے شعور کی پہلی انگڑائی حیرت تھی۔ حال کے غیر یقینی حالات ماضی کی پرصعب راہوں اور مستقبل کے دشوار گزار تصور نے انسان کے ذہن پر تحیر کی کیفیت طاری کر دی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ ازل اور ابد کے درمیانی وقفہ سے گزرتا ہوا وقت بھی اپنے جلو میں ہزاروں مسایل لایا تھا۔ موت اور حیات کی اُلجھنوں کو بھی انسان کے ناخن تدبیر کو حل کرنا تھا۔ لیکن ابھی تک اس کا ذہن اس قدر خام کار تھا کہ تخلیق کے راز کو نہ سمجھ سکا تھا، موسم کی تبدیلیوں کا واضح ادراک نہ رکھتا تھا اور ہر خوشگوار یا ناخوشگوار طبعی و غیر طبعی تبدیلی کو دیوتاؤں کے رحم و غضب سے تعبیر کرتا تھا۔ لیکن زندگی کی تڑپ اور اس کے امکانات نے خارجی حالات کی بے رحم جبریت سے ساز کر کے اپنے جال انسانی ذہن کے گرد بننا شروع کر دئے تھے۔ وقت کا پہیہ برابر گردش کر رہا تھا اور تہذیب و مدنیت کی اولین منزلیں طے ہوتی جا رہی تھیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ انسان کی خواہشوں، امنگوں اور آرزوؤں کی جنگ خارجی حالات کے خلاف شدید ہو گئی تھی کبھی اسے سارے عالم میں ایک بے رحم طاقت کارفرما نظر آتی تھی جو اس کی بہترین آرزوؤں کو پامال کر دیتی تھی اور اسے گلشنِ حیات سے نشاط کی کلیاں نہیں چننے دیتی تھی۔ کبھی اس بے پناہ طاقت کے روبرو اس کا سر عبودیت اور عقیدت کے انداز میں جھک جاتا تھا اور کبھی والہانہ سرشاری اور وارفتگی کے عالم میں اس کے دل کی گہرائیوں سے جو نغمہ بلند ہوتا تھا وہ اس طاقت کے دل کش مظاہر کی محبت اور تعریف میں ڈوبا ہوا ہوتا تھا۔ اس طرح انسان نے فطرت کی دلکشی اور رعنائی میں گم ہو کر جمالیاتی حیرت کا جو پہلا درس لیا تھا وہ اسے ذہن کے اس پراسرار دھندلکے کی جانب لے گیا جہاں علم کی راہیں پوری طرح روشن نہیں ہوتی ہیں۔ پھر بھی زندگی کی جدوجہد اور بقائے حیات کی ہر کوشش کے ساتھ جہاں بیت سے نئے مسایل اُبھرتے جا رہے تھے وہاں کئی پرانی اُلجھنیں سلجھ بھی گئی تھیں اور زندگی کی ہر نئی منزل انسانی علم و یقین میں اضافہ کرتی جا رہی تھی۔

غاروں میں زندگی بسر کرتے تھے انسان نے چھوٹے چھوٹے گروہ بنا کر رہنا سیکھا تھا اور جنگلی پھلوں کی تلاش میں یا جانوروں کے شکار کی خاطر گھومتے پھرتے اسے ایک جگہ مل جل کر معاشرتی زندگی گزارنے کا سلیقہ آیا تھا۔ اب تک انسان کی حیثیت اس وسیع کرۂ ارض پر ایسے غیر اہم حیوان کی تھی جو خوراک کی تلاش میں جگہ جگہ مارا مارا پھرتا ہے اور جسے آسانی سے دوسرے قوی الجثہ جانور اپنی غذا بنا لیتے ہیں لیکن انسان کی مسلسل کاوشوں سے پانسہ پلٹ گیا اور وہ جو اب تک فطرت کی ناز برداری میں مصروف تھا فطرت اس کے ناز اُٹھانے لگی۔ اب سے تقریباً چھ سات ہزار سال قبل جب انسان نے مستقلاً ایک جگہ قیام کر کے زرعی زندگی شروع کی تھی تو اس نے گویا منظم اجتماعیت کی جانب پہلا قدم اُٹھایا تھا۔ ہماری آج کی تہذیب بہت کچھ اس پہلے قدم کی رہین منت ہے۔ اس وقت پہلی بار انسان کو خیال ہوا تھا کہ خارجی ماحول کے مطابق خود کو ڈھالنے کے ساتھ ساتھ خارجی ماحول کو بھی سماجی زندگی کے مطابق بنایا جا سکتا ہے اور یہی خیال تہذیب کی ابتدا ہے یہیں سے معاشرت میں سماجی یکجہتی ( Social Solidarity ) کی بنیاد پڑتی ہے اور تسخیر کائنات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ انسان نے اس معاشرت میں نہ صرف زرعی آلات، پودوں اور جانوروں کی کاشت پر توجہ کی بلکہ موسیقی، رقص، ڈراما اور شاعری بھی کسی نہ کسی شکل میں پروان چڑھتی رہیں۔

اس دور کی ذہنی تخلیقات کو پورے طور سے سمجھنے کے لئے ہمیں اس عہد کے رسم و رواج کا جایزہ لینا پڑے گا۔ اس وقت جب ریاست کسی باقاعدہ شکل میں قایم نہیں تھی یہ ضروری تھا کہ انسانوں کے چھوٹے گروہوں کے تحفظ کی خاطر انھیں رسوم کی کڑی زنجیروں میں جکڑ دیا جائے تاکہ اجتماعیت کا شیرازہ بکھرنے نہ پائے۔ اس لئے انسان نے سماجی ضرورتوں کے تحت اپنے افعال کو رسموں کے سانچے میں ڈھال دیا تھا اور رواج کو اپنا رہنما تسلیم کر لیا تھا۔ اس طرح اس کی انفرادی آزادی اجتماعی مفاد کی پابند ہو گئی تھی اور اصلیت یہ ہے کہ تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ ہی انسان کی انفرادی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ ورنہ خانہ بدوشی یا زرعی زندگی کے ابتدائی دور میں انسان بہت کم قبیلے یا خاندان کی زندگی سے غیر متعلق ہو کر سوچتا تھا۔ وہ اپنے قبیلے کی سرداری کی خاطر یا خوبصورت عورتوں کے لئے کشت و خون کر سکتا تھا لیکن وہ ہر حالت میں خود کو قبیلے کی زندگی سے وابستہ سمجھتا تھا اس لئے تہذیب کے ابتدائی دور میں انسانوں کے نفسیاتی اور جمالیاتی محرکات کا جایزہ لیتے ہوئے ہم ان کی معاشرتی زندگی میں روایات، رسمیات، اور مذہبی یا نیم مذہبی اثرات کی اہمیت کو فراموش نہیں کر سکتے ہیں۔ کیونکہ ان کی اجتماعی روح کا پرتو نظر آتا ہے اسی طرح عبادت اور مذہبی رسوم کی بھی ان کی زندگی میں بڑی اہمیت تھی۔ فصلیں بوئی جانے سے پہلے زمین کی شادابی کی خاطر اجتماعی طور پر مذہبی رسوم ادا کی جاتی تھیں۔ اسی طرح فصلیں کاٹے جانے کے بعد خوشیاں منانے میں سب شریک ہوتے تھے اور دیوتاؤں کے حضور میں اپنی شکر گزاری کے جذبات کا اظہار کرتے تھے۔ دھرتی کے ان بیٹوں کی نظر ہمیشہ آسمان پر رہتی تھی اور بارش کا پہلا چھینٹا ان میں نئی زندگی پیدا کر دیتا اور انھیں نئی امنگ اور سرشاری بخشتا تھا۔ اسی طرح قحط کے دنوں میں یا ناکافی بارش کی وجہ سے ان کے دل کے کنول مرجھا جاتے تھے اور وہ لرزتے ہوئے قدموں اور کانپتی ہوئی آواز میں اپنے دیوتاؤں سے رحم کی التجا کرتے تھے۔ ان کی خوشی اور غم کا پیمانہ محدود تھا جو ذرا سی موسم کی تبدیلی سے بھر جاتا اور چھلک اُٹھتا تھا لیکن انکا زندگی

سے قرب حقیقی تھا اور انھیں آج کے انسان کی طرح جھوٹی خوشیاں اور موہوم غم پریشان نہیں کرتے تھے۔ ان کا تخیل لہلہاتے ہوئے کھیتوں کے سائے میں پروان چڑھتا اور گیہوں کے سنہرے خوشوں کی ضیائیں جذب کرتا رہتا تھا۔ ان کے افکار میں ان کی زندگی کی حقیقتیں جھلکتی تھیں۔ قبیلوں کے الگ الگ دیوتاؤں کا وجود اس امر کا شاہد تھا کہ تہذیب ابھی ابتدائی حالت میں تھی لیکن ایک ہزار سال قبل مسیح جب اسرائیلی تہذیب میں توحید کا عقیدہ آیا تو انسانی سماج نے بڑی حد تک منظم وحدت کی شکل اختیار کر لی تھی اور انسانی تصور رفتہ رفتہ سلجھ کر خدا اور کائنات کے متعلق ایک واضح اور مربوط نظریہ قایم کر رہا تھا۔

آج کے انسان کے لئے یہ ممکن ہے کہ اگر اسے کسی سنسان اور غیر آباد جزیرے میں رہنا پڑ جائے تو بھی وہ اپنی ذہنی تخلیقات جاری رکھ سکے۔ کیونکہ اس کے پاس روایات کا لامحدود ذخیرہ ہے۔ انسانی محسوسات کے متعلق اس کا علم کافی وسیع ہے اور پھر مختلف جذبات و احساسات کا اسے ذاتی تجربہ ہے۔ ان سب باتوں کے علاوہ اسے آرٹ کے واضح طریقۂ اظہار سے بھی آگاہی ہے جس کی مدد سے وہ احساس اور اظہار کی منزلیں طے کر سکتا ہے۔ اس لئے ہمیں یہ ممکن معلوم ہوتا ہے کہ خاموشی اور تنہائی میں بھی اس کی روح کا کرب یا ذہن کا لاوا کبھی کسی واضح شکل میں پھوٹ نکلے اور آرٹ کے اعلیٰ سانچے میں ڈھل جائے۔ اس کے برخلاف ابتدائی انسان کے متعلق جسے ابھی سماجی زندگی کا کوئی تجربہ نہیں ہے آرٹ کی تخلیق کا گمان بھی نہیں کیا جا سکتا ہے۔ (حالانکہ انسانی زندگی میں ایسے وقت کا قیاس بھی مشکل نظر آتا ہے)۔ ہاں جب سے انسانوں نے گروہ بنا کر خانہ بدوشی کی زندگی شروع کی تب سے آرٹ کے کسی واضح تصور کا پتہ چل سکتا ہے۔ کیونکہ کائنات کے متعلق انسان کا احساسِ حیرت یا وہ کیفیتیں جنھیں وہ اس وسیع کرۂ ارض پر وقتاً فوقتاً محسوس کرتا رہا ہے، بذاتِ خود آرٹ نہیں ہیں جب تک کوئی مناسب ذریعۂ اظہار ڈھونڈھ کر معرضِ اظہار میں نہ آجائیں۔ اور اظہار کی حیثیت ہمیشہ سماجی رہی ہے۔ اس لئے آرٹ سے پہلے ہمیں سماجی زندگی کا وجود فرض کرنا پڑتا ہے جہاں انسان کسی نہ کسی شکل میں اپنی باتیں دوسروں کو سمجھاتا اور ان کی باتیں خود سمجھتا ہے۔ انسان تو خیر ایسا جانور ہے جسے سلسلۂ ارتقاء نے دوسرے حیوانات سے ممتاز کر دیا ہے، وحشی جانوروں کے وہ ریوڑ بھی جو اکھٹے زندگی گزارتے ہیں اپنی ضرورت کی خاطر چند آوازوں کا تعین کر لیتے ہیں۔ ان بدلتی ہوئی آوازوں کی خصوصیت سے ان کے جنسی جذبے، رنج اور غصے یا کسی آنے والے خطرے کے اشارے کا احساس ہو سکتا ہے۔ اس لئے جہاں تک انسانوں کا تعلق ہے ہم بغیر کسی شک کے مان سکتے ہیں کہ اس کی ابتدائی آوازیں بھی اس کے ماحول کے تقاضوں کا بے ساختہ اظہار تھیں اور ان میں مفہوم کو ادا کرنے کی قوت پائی جاتی تھی۔ رفتہ رفتہ انسان کی ضروریات ان آوازوں کو ماحول اور سماج کے مطابق نئی نئی شکلوں میں ڈھالتی رہیں۔ آوازوں کی ان ہی ترقی پاتی ہوئی شکلوں نے باقاعدہ طور پر زبان کا نام پایا جسے انسان کا سب سے بڑا کارنامہ کہا جا سکتا ہے۔ یہ آوازیں جانوروں کی آوازوں سے اس لئے مختلف تھیں کہ ان میں انسان کے شعور کی جھلک تھی اور اسکے احساس و تجربے کے ساتھ ساتھ ان آوازوں میں ہر لحظہ ترقی اور تغیر ہوتا رہتا تھا۔

اس لحاظ سے زبان کی ترقی اور نشو و نما میں انسان کی جسمانی ساخت خصوصاً اس کے ہونٹ، دانت، زبان، تالو، حلق،

گردن کی رگیں اور پھیپھڑوں کی بناوٹ نے آواز پر قابو پانے میں کافی ساتھ دیا ہے۔ رفتہ رفتہ زبان جس کی ابتدا سماجی زندگی میں خیال کے اشارے کی حیثیت سے ہوئی تھی انسان کے ترقی پاتے ہوئے شعور کا عکس بن گئی۔ انسانی علم کی طرح زبان بھی ہمیشہ ترقی پذیر اور تغیر پسند رہی ہے۔ جب بھی اسے جکڑنے اور محدود کرنے کی کوشش کی گئی ہے اس کے سرچشمے سوتے خشک ہو گئے ہیں زبان کی ارتقاء سے صرف یہی نہیں ہوا کہ تہذیب اور کلچر کا ایوان آباد ہو گیا بلکہ انسان میں موجودات عالم کی حقیقت اور ماہیت جاننے کی خواہش بھی بیدار ہو گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ زبان انسانی جذبات اور احساسات کا آئینہ بن گئی۔ کارزارِ حیات میں مرد اور عورت کے بے قید اور بے موسم کے ساتھ نے جنسی طور پر مرد کی فاعلیت اور عورت کی انفعالیت سے ساز کر کے نیاز و ناز کے ہزار راگ چھیڑ دیئے۔

انسانوں کی تہذیبی ترقی کا ذکر کرتے ہوئے ہم اس کے دوسرے بڑے کارنامے کو فراموش نہیں کر سکتے۔ یہ کارنامہ تحریر کی ایجاد تھی۔ جس کے بغیر معاشرت کا وجود مستحکم نہیں ہو سکتا تھا۔ یہاں تحریر کی اولین صورتوں سے بحث نہیں، تصویری خطوں کے ذریعہ یا مختلف اشکال کے طور پر جس طرح بھی تحریر کی ابتدا ہوئی ہو اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کی ایجاد نے نہ صرف روایات، قانون اور ریاست واضح شکل دیدی بلکہ انسانی جذبات کو بھی ایک معین سانچہ مل گیا جس کی مدد سے وہ ایک حد تک وقت کی زنجیروں سے آزاد ہو گئے۔ یعنی اب ادب کی مدتِ حیات انسانی حافظے کی جلد ہی اُٹھ جانے والی بساط نہ رہی تھی بلکہ خود ادب کے حیات بخش عناصر اس کی زندگی متعین کرتے تھے۔ سالہا سال گزرنے کے باوجود آج بھی یونانی ادب پڑھا جاتا ہے کیونکہ اس میں انسان کے عہدِ طفلی کی سادگی جھلکتی ہے۔ جیسے کائنات نے شرمیلی دلھن کی طرح پہلی بار اس ادب کے آئینہ میں اپنی آنکھیں کھولی ہوں۔ یونانی ادب حیات کی عشوہ سامانیوں کے متعلق پھیلا ہوا احساسِ جمال ہے۔ جس میں احساس کی تازگی اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ اسی لئے سفوکلیس ( Sophocles ) کی شاعری میں ہر کانٹا چھوتی تھرتھراہٹوں کا حامل ہے۔

قدیم انسانی سماج میں شاعری کے علاوہ دیگر فنونِ لطیفہ کا وجود بھی اپنی ابتدائی شکل میں ملتا ہے جس میں شاید سب سے زیادہ قدامت رقص کو حاصل ہے۔ کیونکہ شاعری اور موسیقی دونوں زبان کی پیدائش کے بعد کی چیزیں ہیں لیکن رقص میں جسم کی حرکات ہی اظہار کا واحد ذریعہ بن جاتی ہیں۔ رقص اور موسیقی دونوں وسیلوں سے دیوتاؤں کے حضور میں انسان نے اپنے احساسِ عبودیت کا اظہار کیا ہے۔ اسی لئے رقص اور موسیقی عبادت میں شامل رہے ہیں۔ جس کا سلسلہ مندر کی دیوداسیوں اور کلیسا کی خواریوں تک چلتا ہے۔ انسانوں کی تہذیبی ترقی کے دور میں مذہبی کرداروں اور دیومالاؤں کو بھی خاص موقعوں پر پیش کیا جانے لگا جس نے بعد میں ڈراما نگاری کی بنیاد رکھی۔ ابتدا میں موسیقی اور ڈراما نگاری بھی شاعری کا حصہ تھے۔ شاعری کا تعلق ہمیشہ انسانوں کے شعورِ نغمہ سے رہا ہے اور آج بھی باقی ہے۔

حنیف فوقی ایم۔ اے

# باب الاستفسار

## رویتِ ہلال

(جناب عبدالعلی محسن علی صاحب - منڈسور)

رویتِ ہلال پر آپ نے نگار میں اظہار خیال فرمایا ہے یا نہیں، اس کی مطلق خبر نہیں، لہٰذا اسی کے متعلق چند باتیں دریافت کرکے زحمت دے رہا ہوں۔ براہِ کرم معاف فرمائیں

پیروانِ اسلام میں بجز استثنائے فرقۂ شیعہ اسماعیلیہ باقی تمام حضرات سال ماہ اور ایام کی تعیین کے لئے عینی مشاہدۂ ہلال پر قطعیں رکھتے ہیں۔ فرقۂ مذکورۂ بالا فرقہ ہی ایسا ہے جو حساب سے برسوں قبل کے مہینے اور تاریخ معلوم کرلیتے ہیں۔ رویت ہلال کی حمایت میں بطور تمہید جو حدیث نبوی پیش کی جاتی ہے اس سے قطع نظر کرکے اگر دیکھا جائے تو تعیین تاریخ ایسے زبردست اور ضروری مسئلہ کا منحصر بفرد کے مشاہدہ پر ہی منحصر ہونا اسلام ایسے مذہب کے لئے جو کہ نوعِ انسانی کے لئے باضابطہ نظام حیات پیش کرنے کا مدعی ہے نہایت شرمناک آمیز بات ہے۔ زمانۂ موجودہ میں جبکہ سائنس اور فلکیات کی ترقی کا یہ عالم ہے کہ ہیئت داں برسوں قبل دور دراز سیاروں کی رفتار معلوم کرکے ان کے نظر آنے کا وقت بتادیتے ہیں تو پھر تعیین تاریخ جیسا معاملہ کیونکر مناسب ہے۔ فرقۂ شیعہ اسماعیلیہ (جماعت بوہرہ) کے پاس اتنا مکمل حساب تعیین تاریخ کا ہے جو ہمارے لئے بہت مفید و کارآمد ہوسکتا ہے تو کیوں تمام مسلمان اس حساب پر اتفاق نہ کرکے آج بھی اسی صدیوں پرانے طریقے پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔

اس مسئلہ پر براہ نوازش روشنی ڈالتے ہوئے سائنسی نقطۂ نظر سے بالتفصیل بحث فرماکر اپنے خیالات سے آگاہ فرمائیں۔

---

(نگار) مذہب کے مسایل پر سائنس کے نقطۂ نظر سے غور کرنا، سائنس کی خدمت تو ضرور ہوسکتی ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ وہ مذہب کی کبھی خدمت نہیں، کیونکہ مذہب کا مقصد و صرف اخلاق کی اصلاح ہے اور سائنس کو اس کی صحت کا معیار قرار دینا کبھی مفید نہیں ہوسکتا جبکہ خود سائنس کے نتائج بھی یقینی نہیں۔

اسلام نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ سائنس کے مسایل پر روشنی ڈالنے آیا ہے لیکن اس نے ہر شخص کو غور و تفکر کی دعوت دیکر

اس کی اجازت ضرور دیدی ہے کہ انفرادی طور پر وہ علوم وفنون حاصل کرے، بشرطیکہ یہ ترقی اخلاق کو خراب کرنے والی نہ ہو اور اسی لئے اجتماعی مسایل میں اس نے سائنس کے درخور کو کبھی پسند نہیں کیا کیونکہ اس طرح اصولی اختلافات اور تشتت وانتشار کا اندیشہ تھا۔

رویت ہلال کا مسئلہ بھی اجتماعی مسئلہ ہے اور اس میں اُلجھن پیدا کرنا مناسب نہ تھا، اس لئے اس کو نہایت سادہ طور پر اس طرح طے کر دیا کہ جب ۲۹ کو چاند نظر آجائے تو سمجھ لو کہ مہینہ ختم ہو گیا اس اُلجھن میں پڑنے کی ضرورت نہیں کہ مطلع ابر آلود تھا یا نہیں یا یہ کہ ریاضیات فلکی کی رو سے اس کی رویت فلاں دن ضرور ہونا چاہیئے۔

ایک مہینہ کا اختتام اور دوسرے مہینہ کا آغاز متعین کرنے کے لئے یہ اتنا سادہ طریقہ تھا کہ اس کو ہر شخص بہ آسانی سمجھ سکتا تھا اور آپس میں کسی اختلاف کی گنجایش نہ رکھتا تھا۔ آپ غالباً یہ چاہتے ہیں کہ اسلامی تقریبات ساری دنیا میں ایک ہی دن منائی جائیں لیکن یہ ممکن نہیں۔

زمین چونکہ کروی شکل رکھتی ہے اس لئے چاند اور سورج کے طلوع وغروب کے اوقات اس میں ہر جگہ یکساں نہیں ہو سکتے۔ جس وقت آفتاب یہاں غروب ہوتا ہے امریکہ میں طلوع ہوتا ہے اور اس طرح تقریباً ایک دن کا فرق پڑ جاتا ہے۔ اس لئے اگر تاریخ قمری کا آپ کے یہاں کوئی مکمل حساب ہو تو بھی دن کا اختلاف تو ضرور ہوگا اور آپ کا یہ مقصود کہ کسی تقریب کو تمام دنیا کے مسلمان ایک ہی دن منائیں کبھی پورا نہیں ہو سکتا۔ اس صورت میں کوئی ضرورت اس کی محسوس نہیں ہوتی کہ رویت ہلال کے مسئلہ میں فلکیات سے کام لیا جائے۔

آج کل رویت ہلال کے باب میں تار اور ریڈیو کی خبروں پر بھی اعتماد کیا جاتا ہے۔ لیکن میرے نزدیک یہ بھی کوئی مناسب طریقہ نہیں کیونکہ اس سے بھی مسئلہ کی سادگی پر اثر پڑتا ہے۔

اگر مختلف مقامات کے تمام مسلمان ایک جگہ جمع ہو کر عیدین کی نماز ادا نہیں کر سکتے تو اس میں کیا حرج ہے کہ مختلف مقامات کے مسلمان مختلف دنوں میں اسے ادا کریں جبکہ اس طرح اسلام کے بتائے ہوئے طریقہ کی سادگی بھی قایم رہتی ہے اور غرہ ورمضان کے حساب سمجھنے پر بھی عوام مجبور نہیں ہوتے۔

---

# باؤرے نین

(جناب اکرم دھولیوی)

ہندی میں "باؤرے نین" بڑی کثرت سے مستعمل ہے۔ اُردو یا فارسی میں اتنی ہی رنگین و برجستہ ترکیب کی مجھے تلاش ہے۔ "متوالی آنکھ" اور "چشم خمار آگیں" میری نظر سے گزرے مگر تسلی نہ ہو سکی، اگر آپ کی نظر میں کوئی اور ترکیب ہو تو مطلع کیجئے۔ عین کرم ہوگا

(نگار) اُردو میں "آنکھ" سے متعلق محاورات تو سیکڑوں ملتے ہیں لیکن اس کی صفات بہت کم نظر آتی ہیں اور جو صفات ہیں بھی تو

ان کا تعلق زیادہ تر فارسی سے ہے۔

نین آنکھ کے معنے میں قدماء کے یہاں مستعمل تھا، لیکن بعد کو ترک کر دیا گیا، حالانکہ ایسے سبک لفظ کو ترک نہ کرنا چاہئے تھا۔ اس میں شک نہیں کہ "باؤرے نین" بڑی پیاری ترکیب ہے، یہاں تک کہ خود ہندی میں جو چند مخصوص و متعین صفات آنکھ کی مستعمل ہیں، ان میں بھی اس ترکیب کو خاص امتیاز حاصل ہے۔ "باؤرے نین" کے علاوہ "مدبھرے نین" اور "چنچل نین" بھی ہندی میں بکثرت مستعمل ہیں، لیکن شاید "باؤرے نین" سے بہتر نہیں۔

اُردو میں آنکھ کی صفت شرابی، متوالی اور مے پی بھی استعمال کی گئی ہے جو نسبتاً ہندی سے ترکیبوں سے قریب تر ہے، اُردو میں آنکھ کے معنی میں فارسی لفظ چشم بکثرت استعمال کیا گیا ہے، لیکن ہمیشہ ترکیب کے ساتھ۔ تنہا لفظ چشم بغیر کسی ترکیب کے آنکھ کے معنے میں اُردو ادب میں کہیں نظر نہ آئے گا۔ یعنی یہ کبھی نہ کہیں گے کہ "اس کی چشم اچھی ہے" یا "اس کی چشم نے مجھے مار ڈالا" بلکہ ایسے مواقع پر ہمیشہ آنکھ ہی کا لفظ استعمال کیا جائے گا۔ فارسی میں البتہ چشم کے لئے اتنے صفاتی الفاظ استعمال کئے گئے ہیں کہ شاید ہی کسی اور ادب میں نظر آئیں۔

ان صفات کی وسعت کا یہ عالم ہے کہ اگر ہم ان کی تقسیم کرنا چاہیں تو "دُنیائے کمیت و کیفیت" کی شاید ہی کوئی ایسی چیز ہوگی جس سے شعرائے فارسی نے چشم کی صفات متعین کرنے میں کام نہ لیا ہو۔

فارسی میں لفظ چشم، آنکھ اور نگاہ کے علاوہ امید کے معنے میں بھی مستعمل ہے۔ (غالب کا مصرعہ ہے:۔ خطا نمودہ ام و چشم آفریں دارم)، لیکن ہمیں اس مفہوم سے بحث نہیں صرف آنکھ اور نگاہ کے مفہوم کو سامنے رکھ کر دیکھنا ہے کہ اس کی صفات میں کن کن جدتوں سے کام لیا گیا ہے۔

وہ ترکیبیں جن کا تعلق دُنیائے حیوانات سے ہے ان میں زیادہ تر آہو کو سامنے رکھا گیا ہے مثلاً آہو فریب ۔ آہو گیر ۔ آہو بچہ ۔ آہو انداز ۔ جانوروں میں شیر کو بھی لیا گیا ہے جیسے شیر شکار و شیر گیر لیکن کم۔

اس سلسلہ میں شکاری چڑیوں کی طرف بھی ان کا خیال گیا اور شہباز و تیز چنگ کی ترکیبیں اختراع کی گئیں۔ کیڑے مکوڑوں میں سے انھوں نے صرف زنبور سرخ کو تشبیہ کے لئے منتخب کیا۔

جنگ و قتال اور اسلحۂ جنگ کو سامنے رکھ کر انھوں نے البتہ بہت سی صفات ایجاد کیں مثلاً: تیر انداز ۔ کماندار۔ ناوک افگن خونریز۔ خونخوار ۔ قاتل ۔ ظالم ۔ غارتگر۔ مردم آزار۔ مردم کُش، یہاں تک کہ نمرود، ضحاک اور فرعون بھی۔

سحر و ساحری کے سلسلہ میں ۔ جادو وش ۔ جادو فریب ۔ فسوں ساز۔ ہاروت ۔ چاہ بابل وغیرہ کی ترکیبیں استعمال کی گئیں۔

پھولوں میں البتہ صرف ایک نرگس کو لیا اور اس پر خوب خوب طبع آزمائی کی۔ مثلاً:۔ نرگس بیمار ۔ نرگس گویا۔ نرگس لالہ رنگ ۔ نرگس نیم خواب ۔ نرگس مستانہ۔ نرگس خواب آلود۔ نرگس فتنہ زا وغیرہ وغیرہ۔ نیلگوں آنکھوں کے لئے نیلوفر کو سامنے

رکھ کر شعلۂ نیلوفری کی ترکیب اختراع کی۔ پھلوں میں بادام کے سوا انھیں کوئی اور چیز نہیں ملی۔ شراب و متعلقات شراب کو سامنے رکھ کر بہت سی صفات پیدا کی گئیں۔ مثلاً :۔ مست ۔ سیہ مست ۔ نیم مست ۔ مخمور ۔ خمار آلو ۔ بادہ پیما میگوں ۔ مے پرست۔ پیمانہ۔ ساغر۔ شیشہ۔

کیفیاتی تشبیہات بھی فارسی میں بہت پائی جاتی ہیں۔ مثلاً :۔ شرگیں ۔ شرم آلود ۔ حجاب آلود ۔ خوش نگاہ۔ دلآویز۔ دل آشوب ۔ تغافل شعار ۔ سخن گو ۔ دلبر ۔ دلفریب ۔ ناتواں ۔ بیمار وغیرہ۔

یہ تو وہ صفات ہیں جن کا تعلق معشوق کی آنکھ سے ہے۔ عاشق کی آنکھ کی جو صفات فارسی میں پائی جاتی ہیں، ان میں زیادہ تنوع نہیں ہے، زیادہ تر اشک و گریہ کو سامنے رکھا گیا ہے :۔

پُرآب، نم زدہ، ژالہ بار، گہر بار، گہر فروش، دُرفشاں، دجلہ بار، خونبار، خونفشاں، اشکبار، طوفانی، طوفاں جوش وغیرہ کیفیات کے لحاظ سے بھی بعض صفات وضع کئے گئے مثلاً :۔

حیران ۔ حیرت آلود ۔ حسرت نشان ۔ گراں خواب وغیرہ۔

اب رہا آپ کا اصل سوال کہ باؤرے نین کے انداز کی کوئی ترکیب اُردو فارسی میں کیا ہو سکتی ہے، سو اس کا تعلق زیادہ تر ذوق سے ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اُردو میں "متوالی آنکھ" اور فارسی میں چشم مخمور، چشم مست، چشم سیہ مست، کی ترکیبیں "باؤرے نین" سے زیادہ ملتی جلتی معلوم ہوتی ہیں۔

---

# زندگی کی قدریں

## (جناب سید محمد حسنین صاحب۔ فیض آباد)

آجکل لٹریچر میں اکثر "اقدارِ حیات" کا ذکر سننے میں آتا ہے۔ ازراہِ کرم مطلع فرمایئے کہ یہ کیا چیز ہے اور موجودہ زمانہ میں کون سے اقدارِ حیات کام کر رہے ہیں؟

---

(نگار) نوعِ انسان کے زندگی کی ضروری قدریں کیا ہیں؟ اس کا کوئی جواب نہیں دیا جا سکتا کیونکہ ہر قوم کی قدریں مختلف ہوتی ہیں اور زمانہ کے ساتھ ساتھ ان میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے، تاہم اچھی غذا، اچھی صحت، زندگی کا تحفظ، اور خوف و فکر سے آزادی ضرور ایسی مشترک اغراض ہیں جن پر قریب قریب تمام قوموں کا اتفاق ہے اور اس لئے ان کو زندگی کی ضروری قدریں کہا جا سکتا ہے۔

ایک شخص خود اپنے ہی اغراض میں منہمک رہتا ہے اور دوسرے لوگوں کے اغراض جو اس سے مختلف ہوتے ہیں اسے بہت عجیب معلوم ہوتی ہیں۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ ایک ہی چیز جو ایک قوم کے لئے قیمتی ہے دوسری قوم کے لئے ناقابل توجہ ہے۔ اس کے علاوہ یوں بھی جو چیز آج عزیز ہے وہ دس سال کے بعد اپنی قیمت کھو بیٹھتی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہم ایک چیز کی اسی وقت قدر کرتے ہیں جب تک وہ ہمارے اغراض کا ساتھ دیتی ہے۔

زندگی کی قدروں کے متعلق جو مختلف رائیں اور اصول قایم کئے جاتے ہیں ان کا تعلق مختلف اسباب سے ہے۔ مثلاً موسم کو لیجئے گرم ممالک کے رہنے والے اپنے مکانوں کے چاروں طرف سایہ دار درخت نصب کرنا پسند کرتے ہیں اور سرد ملکوں کے باشندے ایسی جگہ پسند کرتے ہیں جہاں دھوپ کا گزر آسانی سے ہو۔ ہمارے ماحول کو بھی اقدار زندگی کے انتخاب میں بڑا دخل ہے، افریقہ اور آسٹریلیا کے جنگی باشندوں کے لئے سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ وہ درندوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکیں۔ لیکن شہر کے رہنے والوں کے سامنے یہ سوال نہیں ہے۔

قومی روایات اور رسم و رواج کو بھی اقدار زندگی کی تعیین میں بڑا دخل ہے، مثلاً قدیم ہندوستان میں ایک عورت کے لئے یہ امر باعث لعنت خیال کیا جاتا تھا کہ وہ شوہر کے لئے زندہ رہے اس لئے شوہر کی وفات کے بعد موت کی جستجو اس کی زندگی کی ایک ضروری قدر تھی لیکن اب یہی رسم جرم خیال کی جاتی ہے۔

یونان کی اسپارٹا قوم میں سپہ گری زندگی کی نہایت اہم قدر تھی، چنانچہ ان کے یہاں رسم تھی کہ نوجوانوں کو جنھیں فوجی تربیت دیجاتی تھی مامور کیا جاتا تھا کہ رات کے وقت قفل توڑ کر یا نقب لگا کر لوگوں کے مکانوں میں گھسیں اور چوری کریں، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی التزام تھا کہ جن مکانوں میں انھیں داخل ہونا ہوتا تھا وہاں کے لوگ پہلے سے ہوشیار کر دئے جاتے تھے۔ اگر یہ نوجوان اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوتے تھے اور گرفتار کر لئے جاتے تھے تو وہ نااہل سمجھے جاتے تھے۔ الغرض وہاں نقب زنی اور چوری زندگی کی نہایت اہم قدر سمجھی جاتی تھی، لیکن اب وہ جرم ہے۔

یہ مثل سچ ہے کہ ضرورت ایجاد کی مادہ ہے، جب تک ہمارا کام کسی بات سے نکلتا رہتا ہے ہم اس کو اپنی زندگی کا اہم مقصد سمجھتے رہتے ہیں لیکن جب اس سے کوئی کام نہیں نکلتا تو اسے ترک کر دیتے ہیں۔

اس زمانہ کے اقدار کا تعلق یکسر اقتصادیات سے ہے، یعنی اب صرف ایک ہی فکر انسان کے سامنے ہے، یعنی یہ کہ وہ جئے کیونکر، گرانی بڑھتی جا رہی ہے، اور حکومتیں اس مسئلہ کو بھی صرف سیاسیات کے نقطۂ نظر سے دیکھتی ہیں۔ پھر اگر تمام دنیا کی حکومتوں کا نظریہ ایک ہی ہوتا تو بھی مضایقہ نہ تھا، لیکن مصیبت یہ ہے کہ انسان اس حیثیت سے دو محاذ میں تقسیم ہو گیا ہے، ایک جماعت کہتی ہے کہ دنیا کا امن و سکون اور اقتصادی دشواریوں کا علاج صرف ڈاکریسی میں ہے، دوسرا محض اشتراکیت کو ذریعۂ نجات قرار دیتا ہے۔ اس لئے جب تک اصولاً یہ طے نہ ہو جائے کہ ان دو میں کون صحیح و درست ہے، اس وقت تک اقتصادی مشکلات دور نہیں ہو سکتیں۔

اگر دونوں نظریوں کے حامی واقعی خلوص نیت سے غور کرنے پر آمادہ ہوں تو ممکن ہے کوئی درمیانی صورت مفاہمت کی پیدا ہو جائے، لیکن وہاں تو صورت حال یہ ہے کہ ایک دوسرے کی سننا ہی نہیں چاہتا۔ اشتراکیت کے خوف سے ڈماکریسی پر خفقان کے دورے پڑ رہے ہیں اور اشتراکیت کو چونکہ اپنی کامیابی کا یقین ہے اس لئے وہ ڈماکریسی کے اس خوف و ہراس سے نہایت خاموشی کے ساتھ فایدہ اٹھا رہی ہے اور کھلم کھلا تصادم سے گریز کر رہی ہے، کیونکہ اسے یقین ہے کہ ڈماکریسی کو ایک نہ ایک دن خود اپنے ہی بوجھ سے فنا ہو جانا ہے۔

پھر سچ پوچھئے تو خطرہ یہ نہیں ہے کہ اشتراکیت و جمہوریت میں جنگ کے امکانات قوی ہوتے جا رہے ہیں بلکہ یہ کہ اشتراکیت جنگ کرنا نہیں چاہتی اور لڑائی ملتوی ہوتی جا رہی ہے اور یہی وہ بیم و رجا کی کیفیت ہے جس نے انسان کے دل و دماغ کو بیکار کر رکھا ہے، کسی مصیبت کا اندیشہ خود اس مصیبت سے زیادہ تکلیف دہ ہوا کرتا ہے اور آج کل دنیا اسی دور سے گزر رہی ہے۔

ان حالات میں اقدارِ حیات کے تعین کا کوئی سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ انسان اس سیلاب میں بہا جا رہا ہے اور کچھ پتہ نہیں کہ انجام کیا ہونا ہے، کہیں پاؤں ٹکیں تو وہ سوچے کہ سیلاب اسے کہاں سے کہاں لے گیا اور ساحل کہیں نظر بھی آتا ہے یا نہیں۔

---

# نگار کے پرانے پرچے

سنہ ۳۷ء = سالنامہ (ڈرامہ اصحاب کہف) عہ - مارچ ۶ر - اپریل ۸ر - مئی ۸ر - جون ۶ر - جولائی ۸ر - اگست ۸ر

سنہ ۳۱ء = سالنامہ (فرمائشی تحریر) عہ - جولائی ۶ر - اگست ۸ر - ستمبر ۸ر - اکتوبر ۱۲ر - نومبر ۶ر - دسمبر ۶ -

سنہ ۳۲ء = فروری ۸ر - مئی ۸ر - جولائی ۸ر - ستمبر ۸ر — سنہ ۳۳ء = فروری ۸ر سنہ ۳۸ء = سالنامہ (تاریخ اسلامی ہند) عہ - اپریل ۸ر - مئی ۶ر - جون ۶ر - جولائی ۶ر - اگست ۶ر - ستمبر ۶ر - اکتوبر ۶ر - نومبر ۶ر - دسمبر ۶ر -

سنہ ۳۹ء = سالنامہ (مصحفی نمبر) عہ - فروری ۶ر - مارچ ۶ر - اپریل ۸ر - مئی ۶ر - سنہ ۴۰ء = فروری ۶ر - مارچ ۶ر اپریل ۶ر - مئی ۶ر - اکتوبر ۶ر - سنہ ۴۱ء = جون تا دسمبر ۶ر فی پرچہ - سنہ ۴۲ء = مارچ، اپریل، مئی، اگست، ستمبر، اکتوبر، نومبر ۶ر فی پرچہ - سنہ ۴۳ء = سالنامہ ریاض نمبر عہ ر - سنہ ۴۵ء = سالنامہ (قرآن نمبر) ۷ ر - اپریل ۶ر - اگست ۶ر - ستمبر ۶ر اکتوبر ۶ر - نومبر ۶ر - دسمبر ۱۲ر - سنہ ۴۶ء = فروری، مارچ (انتقاد نمبر) عہ ر - اپریل ۴ر - مئی ۴ر - جون ۶ر - جولائی ۴ر - اگست ۸ر - ستمبر ۱۲ر اکتوبر ۱۲ر - ستمبر عہ ر - سنہ ۴۷ء = سالنامہ (ماجد دلین نمبر) عہ - مارچ ۱۲ر - اگست ۱۲ر - ستمبر ۸ر - اکتوبر ۶ر - نومبر ۱۲ر - سنہ ۴۸ء = سالنامہ (پاکستان نمبر) ۷ ر - مارچ ۱۲ر - مئی ۱۲ر - جون ۱۲ر - جولائی ۱۲ر - اگست ۸ر - ستمبر ۱۲ر - نومبر ۱۲ر - دسمبر ۸ر - سنہ ۴۹ء = سالنامہ افسانہ نمبر عہ ر - مارچ ۶ر اپریل ۶ر - مئی ۸ر - جون ۸ر - جولائی ۶ر - اگست ۶ر - سنہ ۵۰ء = سالنامہ (تنقید نمبر) عہ ر - مارچ ۱۲ر - اپریل ۸ر - مئی ۱۲ر - جون ۸ر - جولائی ۸ر - اکتوبر عہ ر - نومبر عہ ر

# دوزخ

## (تیرے "دوزخ" کی یہ "فردوس نمائی" کب تک)

چھا گیا کتنے شگوفوں پہ تباہی کا غبار
ذرّہ ذرّہ ہے یہاں صدق و صفا کا مدفن،
ابھی برپا ہے وہی انجمنِ اہلِ کتاب
دشت بہتر ہے ترے اِن چمنستانوں سے
کھا گئی بادِ خزاں کتنے سمن زاروں کو
کس قدر چاند اُجالے کے لئے روتے ہیں
کب سے خاموش ہیں عرفان و صداقت کے چراغ
زندگی ہوگئی تبدیل گراں جانی میں،
امن و اخلاص کو انسان ترستا ہی رہا
رگِ احساس پہ چلتے رہے نشتر اب تک
روزِ روشن کے جلو میں ہیں اندھیرے کتنے
دین و دولت کے صنم، نسل و سیاست کے صنم
کارواں خاک بسر، شعلہ چکاں راہ گزار
یہ تمدّن کے پجاری، یہ قدامت کے امام
لہلہاتے ہی رہے جہل و قیادت کے عَلَم
تو نے آدم کو دئے خلد و جہنّم کے فریب

کتنے سورج ہیں زمانے میں اندھیرے کا شکار
حسرتیں بیچتی پھرتی ہیں شہیدوں کے کفن
کارفرما ہیں ابھی میری و شاہی کے سراب
باز آیا میں حقیقت کے نہاں خانوں سے
تیز کرتی ہے اجل یاس کی تلواروں کو،
اپنے ہر داغ میں ناسور لئے ہوتے ہیں
عرش پر نقرہ و نیلم کے خداؤں کا دماغ
موت رقصاں ہے کلاہوں کی زرافشانی میں
آگ بڑھتی ہی رہی، زہر برستا ہی رہا
عشق و ادراک کے پرچم ہیں نگوں سراب تک
بن گئے قافلہ سالار لٹیرے کتنے،
یہ فلاکت کے بیاباں، یہ امارت کے صنم
دیکھ ہر موڑ پہ وجدان و بصیرت کے مزار
یہی دُنیا ہے تو یارب تری دنیا کو سلام
بھوک کھاتی رہی بکتی ہوئی عصمت کی قسم
کبھی تسنیم کے دھوکے کبھی زمزم کے فریب

یہ خدائی ہے تو پندارِ خدائی کب تک!

افسر سیمابی احمد نگری

# تخلیقِ آدم

(۱)

فضاؤں میں پیدا ہوئی تھرتھراہٹ خلاؤں میں بننے لگے کچھ ہیولے
خدا کے تصور کا شہکار بن کر کوئی خطۂ ارض پر مسکرایا
ہجومِ ملائک نے آنکھیں بچھائیں، وفورِ مسرت سے سجدے لٹائے
ہوئی بارشِ نور کی زرفشانی، دو عالم نے مستی کا انداز پایا
ملیں وسعتیں تنگنائے زمیں کو، نئی عظمتوں کے دیئے جگمگائے
افق تاب جلووں نے خود کو سنبھالا بکھرنے لگا حسنِ عالم پناہی
ہویدا ہوا خود بخود سینۂ ارض سے بن کے اک غنچۂ ماہتابی،
جو آدم کے خوابوں کی تعبیر بن کر بڑھا لیکے عالم کی کل بادشاہی
بکھرنے لگیں حسنِ نو کی شعاعیں، جلوئے افق میں سحر مسکرائی
شفق کی صباحت گلوں کی نزاکت نے حسنِ مجسم کا انعام پایا
نکل آئے دیدارِ انساں کی خاطر مہ و انجم کی خلوت کدوں سے
اور اس آدمِ نو کی عظمت نے اک "پیرِ دانا" کی عظمت کو نیچا دکھایا

(۲)

## ارتقاء۔

تفوق کی سطوت، غرائم کی صولت، فشارِ تدبر کا یہ زندہ پیکر
اٹھا بربطِ عقل کی لرزشوں میں حدودِ مسلسل کا اعجاز پاکر
کبھی سبزہ زاروں پہ آنکھیں بچھائیں، کبھی لالہ زاروں کو مسکن بنایا
گزرتا رہا منزلِ نو بہ نو سے شعور و تخیل کو رہبر بنا کر

کبھی مہر و مہ سے نگاہیں لڑائیں، نگاہِ تجسس کے ابواب کھولے،
فروغِ تفکر کی غمنا کیوں نے ہر اک شئی کو پروردۂ جہل پایا
رموزِ جہاں کی حکایات چھیڑیں، طربناکیوں کے فسانے سنائے
چمن زارِ ہستی کو سیمیں غداروں کے رقصِ مسلسل سے رنگیں بنایا
عروجِ تفکر کے سحر ترنم نے اہلِ حرم کے قدم ڈگمگائے
اسی سیر گاہ تخیل میں پھنسکر بنایا یقیں اپنے حسنِ گماں کو
کیا ادّعا منکر روح ہوکر، کہ بنیاد ہے مادہ اس جہاں کی
یہ اپنی غلط رہروی تھی، جو تسلیم کرتے تھے ہم قدرتِ بے نشاں کو
بہلتا رہا فکر سود و زیاں سے، مصائب کو خود کردہ اعمال سمجھا
مگر مدتوں بعد سربستہ رازوں میں پھر ایک حرکت سی پیدا ہوئی ہے
یہ کہتے ہوئے بندۂ عقلِ باطل نے پھر کر لیا اعترافِ مشیت
"تفکر کی ناپختگی کی بدولت مری زندگی کتنی رسوا ہوئی ہے"

(۳)

یہ انساں ۔ یہ انساں کہ جس نے خلاؤں میں افکار کے جال پھینکے
ہزاروں تبسم کے ارمان لیکر، نئی آرزوؤں کے ساغر اُچھالے
مصائب تشدد کی پہنائیوں سے ابھرتا رہا عزم کی آنچ کھا کر
جنوں آشنا عزم کی مشعلوں کو بامدازِ نو دست تو میں سنبھالے
پہونچ کر خرابات افکار میں جس نے دیکھی امنگوں کی حسرت نوازی
ستاروں کی دنیا، تبسم کی لہریں، فضاؤں کی شوخی بہت مختصر ہے
مگر عشرتوں کی یہ محدود دنیا بھی انسان کی دسترس میں نہیں ہے
اگر ہے تو بس آرزوؤں کی حسرت، سقوطِ تبسم بہت معتبر ہے
ازل سے یہی سعی پیہم رہی ہے کہ انساں بنے درزش عیش گاہی
مگر جانے کب آئے وہ دورِ عشرت، نہ معلوم کب وہ سکوں لوٹ آئے
کہ جس سے تمنائے خفتہ بر آئے، باندازِ نو زندگی مسکرائے

عبدالہادی رفعت بنگلوری

# اہرمن زار

العجب، یہ جہانِ تیرہ و تار
اہرمن زار ہے کہ آدم زار؟

یہ خراباتِ پُر خراش و خروش
صاعقہ گاہ و دو زخِ خس پوش

وقت، تخریب وقت کا منہاد
دہر، بازیچہ گاہِ شر و فساد

یہ بہشتوں میں سوزِ نارِ جحیم
ساغرِ لالہ گوں میں ماءِ حمیم

متلاطم یہ خون کا دریا،
یہ سلگتے ہوئے یم و صحرا

موج در موج ابلہی و جنوں
خم شکستہ، صراحیاں پُر خوں،

تہ بہ تہ برق و شعلہ و صرصر
زہر میں یہ بجھے ہوئے نشتر

ریگ زاروں میں برق کے تودے
مرغزاروں میں آگ کے خیمے،

آفتابوں پہ ظلمتوں کے غلاف
سینۂ عیش میں غموں کے شگاف

تارے ذروں کی بارگہ میں ندیم
صبحِ روشن دیارِ شب میں مقیم

تیرگی، چاندنی کے ڈیروں میں
ماہ و خورشید گھپ اندھیروں میں

تلخ تر زندگی کا نوشینہ،
زنگ خوردہ نفس کا آئینہ

پرنیاں کی تہوں میں خشت و خزف
تہی نقدِ گہر سے مشتِ صدف

غم کی پرچھائیاں تبسم میں،
ظلمتیں خوابگاہِ انجم میں

پھول کی خلوتوں میں بادِ سموم
آشیانوں میں عندلیب کے بوم

ہاتھ میں جہل کے خرد کی عناں
برف زاروں میں قیدِ برقِ تپاں

نغمے مجروح، ساز و دف زخمی
سوز دل میں نہ روح میں گرمی

سرِ کوثر سلگتے جام و سبو
موجِ نمناکِ وقت، صاعقہ خو

یہ لہو چاٹتے ہوئے شعلے
گرتی بجلی، برستے انگارے

قوم کے سر پہ نکبتوں کے تاج
علم کی پستی، جسم کی معراج

طاق و محراب خون سے لبریز — یادگارِ ہلاکو و چنگیز ،،
زہر، تریاق کے سیوچوں میں — موت ، انسانیت کے کوچوں میں
بھیس میں آدمی کے چوپائے — یہ ہلاکت کے رینگتے سائے
ذہن صدیوں کی وحشتوں کا مزار — مردہ مردہ ضمیر کی جھنکار
خوں اُگلتے ہوئے بلند و پست — نیشتر کتنے روح میں پیوست
آدمی شیطنت کے زینوں پر — عصمتوں کا لہو جبینوں پر،
بھیڑئے معتکف مساجد میں — خون کی ہولیاں معابد میں
تیز سنگینیں نرم سینوں پر — زد چٹانوں کی آبگینوں پر،
زندگانی کی اب سحر کیا ہو، — کھا گئی تیرگی اجالوں کو،

اس خرابے میں زندگانی کے
شعبدہ گہ میں دہر فانی کے
آدمی کی تلاش ہے مجھ کو

فضا ابن فیضی


جھوٹا استہار دینا حرام ہے بس اس سے زیادہ میرے پاس کوئی ثبوت صداقت نہیں ہے ، ماننا نہ ماننا آپ کا فعل ہے

**معجون عنبری**

یہ دوا دنیا بھر میں مقبولیت حاصل کر چکی ہے۔ ولایت تک اسکے مداح موجود ہیں۔ دماغی کمزوری کے لئے اکسیر صفت ہے، جوان، بوڑھے سب کھاتے ہیں، اس دوا کے مقابلہ میں سیکڑوں قیمتی ادویات اور کشتہ جات بیکار ہیں۔ اس سے بھوک اس قدر بڑھتی ہے کہ دو من سیر دودھ اور پاؤ بھر گھی ہضم کر سکتے ہیں، اس قدر مقوی دماغ ہے کہ بچپن کی باتیں بھی خود بخود یاد آنے لگتی ہیں، اس کو مثل آبحیات کے تصور فرمایئے، اس کے استعمال کرنے سے پہلے اپنا وزن کر لیجئے۔ ایک شیشی چھ سات سیر خون آپ کے جسم میں اضافہ کر دے گی۔ اس کے استعمال سے ۱۸ گھنٹے کام کرنے سے "تھکن" نہ ہوگی، یہ دو دار خساروں کو مثل گلاب کے پھول کے سرخ اور مثل کندن کے درخشاں بنا دے گی یہ دوا نئی نہیں ہے بلکہ ہزاروں مایوس العلاج اس کے استعمال سے بامراد ہو کر مثل پندرہ سولہ سال کے جوان بن گئے ہیں۔ یہ نہایت درجہ مقوی باہ ہے کہ آپ صبر و تحمل نہیں کر سکتے۔ القصہ اس کی صفت تحریر میں نہیں آسکتی۔ تجربہ کر کے دیکھ لیجئے اس سے بہتر مقوی دوا دنیا بھر میں نہیں ہے۔

قیمت فی شیشی ۲۴ خوراک چار روپیہ (للعہ)

(نوٹ) فایدہ نہ ہو تو قیمت واپس۔ فہرست دواخانہ مفت منگایئے۔

میں اللہ کو حاضر و ناظر جان کر لکھتا ہوں کہ یہ دوا اکسیر کا کام کرتی ہے۔ نقالوں سے ہوشیار رہئے۔ میری ۳۲ سالہ شہرت پر غور فرمایئے۔

پتہ:۔ حکیم ثابت علی پنج زبان خوش کلام
(عالم مثنوی مولانائے روم صاحب)
محمود نگر نمبر ۳ لکھنؤ۔ یو۔ پی

ہندوستان اور پاکستان کی تمام ریاستوں کے لئے
ایجنسی کے لئے رجوع
ایجنسی نمبر (۳)

## نازش پرتاپگڈھی :

میں نے تو ڈگمگا دئے ہیں جان کر قدم
اب تم ہی دے سکے نہ سہارا تو کیا کروں

چاہا تھا طول دینا شبِ انتظار کو
مانے مگر نہ صبح کا تارا تو کیا کروں

---

دے رہے ہیں صدائیں وہ مجھ کو
میں سمجھتا ہوں دل کی دھڑکن ہے

چُن نہ پایا الم کے خار تمام،
عیش بھی کتنا تنگ دامن ہے

---

بہتر ہے کہ تم بھی مجھے اُسوقت نہ چھیڑو
جب دل کو صدا دیتے ہوں گزرے ہوئے لمحات

---

کھوئی کھوئی سی خیالوں میں مسرت کی کرن
جائے یہ کیوں ہے کہ اُس نے تو پکارا بھی نہیں

---

اب اور کتنا ترکِ تعلق کروں کہ میں
خود سے بھی پیش آتا ہوں بیگانگی کے ساتھ

---

اکثر ہوا ہے یہ کہ نشیمن کے پاس سے
گزرا چلا گیا ہے زمانہ بہار کا

---

ترکِ الفت پر ہوں میں یوں مطمئن،
جیسے سب کچھ کھو کے بھی کچھ پا گیا،

## صفیہ شمیم ملیح آبادی :

یہ کس کے فریب کھا رہے ہیں،
ارمانوں سے دل بسا رہے ہیں

رہ رہ کے اُمڈ رہے ہیں آنسو
یہ دل سے کسے بھلا رہے ہیں

بیچین ہیں بجلیاں فلک پر
گلشن ہیں کہ مسکرا رہے ہیں

ہو خیر، چراغِ بزمِ حسرت،
کیوں شام سے جھلملا رہے ہیں

ساون کے شمیم مست بادل
کیا جانئے کیوں رُلا رہے ہیں

## سید شاہ ولی الرحمان ام - اے :

آج اُٹھتی نہیں میرے دلِ ناکام سے آگ
آ کے برسا دے فروغِ رخ گلفام سے آگ

ہے فروزاں یہ سرطور چراغ لالہ !
یا ہے روشن ترے جلوے کی لبِ بام سے آگ

یہ تری برق نگاہی کا اثر ہے کہ ہنوز
گوشۂ دل میں بھڑکتی ہے ترے نام سے آگ

تیرے جاتے ہی بجھی آتشِ رونق گھر کی
تیرے آتے ہی لگی اُٹھنے در و بام سے آگ

سرد ہیں قلب و جگر خاک ولی اب نکلے
نعرۂ کفر سے یا نعرۂ اسلام سے آگ

# مطبوعات موصولہ

## تاریخ مسلمانان پاکستان وبھارت

انجمن ترقی اُردو پاکستان کی یہ پہلی قابل ذکر تالیف ہے جو قیام انجمن کے بعد وہاں سے شایع ہوئی ہے۔ یہ کتاب ایک مقدمہ اور ۲۱ ابواب پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں محمد ابن قاسم فاتح سندھ کے زمانہ سے لیکر عہد اورنگ زیب تک کی تاریخ تمام ان خصوصیات کے ساتھ پیش کی گئی ہے جو ایک اچھی اور مستند تاریخ کی کتاب میں پائی جانا چاہئے۔

مقدمہ میں ہندوستان کی تاریخ قبل اسلام سے بحث کی گئی ہے جو ایک جامع تبصرہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ پہلے اور دوسرے باب میں مسلمانوں کی فتوحات سندھ اور وہاں عربی حکومت کے قیام اور ان کے عادلانہ نظم و نسق کو بڑے سلیقہ کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، تیسرا باب سلاطین غزنویہ کے لئے وقف ہے، چوتھے باب میں سلطان معزالدین غوری سے لیکر شمس الدین التمش تک کی تاریخ درج ہے، چھٹے اور ساتویں باب میں اس عہد کے نظام حکومت اور ترقی علم و تمدن سے بحث کی گئی ہے، اس کے بعد آٹھویں، نویں، دسویں اور گیارھویں باب میں عہد خلجی و تغلق اور اس کی خصوصیات کو بیان کیا گیا ہے۔ بارھویں باب میں ان مختلف آزاد حکومتوں کا ذکر ہے جو صوبہ داروں نے مختلف اقطاع ہند میں قایم کرلی تھیں اور تیرھویں باب سے لیکر بیسویں باب تک سلطنت مغلیہ کی تاریخ ہے جو بابر سے شروع ہوکر اورنگ زیب پر ختم ہوتی ہے، اکیسویں باب میں گیارھویں صدی ہجری کی مذہبی تحریکات اور دوسری عمرانی ترقیوں پر تبصرہ کیا گیا ہے۔

مولوی ذکاء اللہ پہلے شخص تھے جنھوں نے اُردو میں ہندوستان کی تاریخ کئی جلدوں میں لکھی، اور اس کے بعد پھر کوئی اہم کتاب اس موضوع پر شایع نہیں ہوئی۔ ضرورت تھی کہ تاریخ نویسی کے جدید اصول پر کوئی کتاب پیش کی جاتی اور بڑی خوشی کی بات ہے کہ انجمن ترقی اُردو پاکستان نے اس ضرورت کو پورا کیا۔

اس کے مولف مولوی سید ہاشمی فرید آبادی بڑے مشاق لکھنے والے ہیں اور چونکہ تاریخ سے انھیں بہت دلچسپی ہے اس لئے ان کی اس تالیف کو کامیاب ہونا ہی چاہئے تھا۔ طباعت و کتابت نہایت دیدہ زیب ہے اور کاغذ بھی بہت دبیز استعمال کیا گیا ہے۔ جلد بھی مضبوط و خوبصورت ہے۔ ضخامت ۵۹۴ صفحات۔ قیمت مع محصول ۸ روپے۔ ملنے کا پتہ:۔ دفتر انجمن ترقی اُردو پاکستان ہسپتال روڈ کراچی

## ٹھنڈا گوشت

مجموعہ ہے سعادت حسن منٹو کے آٹھ افسانوں کا۔ اور چونکہ پہلے افسانہ کا عنوان ٹھنڈا گوشت ہے۔ اسی لئے مجموعہ کا نام یہی قرار دیا گیا۔ یہ افسانہ وہی ہے جو منٹو کی تضحیک کے ساتھ ان کے ادبی شہرت کا بھی باعث ہوا

اس افسانہ کی اشاعت پر مقدمہ چلایا گیا، سزا ملی اور اپیل سے بری ہوئے۔ الزام یہ تھا کہ افسانہ فحش و عریاں ہے۔

ابتداء میں خود منٹو نے اس مقدمہ کی تفصیل بیان کی ہے، جو بہت پُر لطف ہے اور بجائے خود ایک ادبی شاہکار ہے۔ منٹو، ہندوستان کے ان چند افسانہ نگاروں میں سے ہے، جنھوں نے قدیم اسلوب کو بدل کر جدید ٹکنک کو رواج دیا اور تکمیل کے ساتھ نباہا۔ ہو سکتا ہے کہ ان کے بعض افسانوں کو مخصوص اخلاقی معیار کے لحاظ سے ناقابل برداشت قرار دیا جائے، لیکن جس حد تک آرٹ کا تعلق ہے ادب میں ان کو خاص جگہ حاصل ہے اور ناک بھوں چڑھانے سے ان کی اہمیت کم نہیں ہو سکتی۔

کتاب بہت اہتمام کے ساتھ نہایت نفیس کاغذ اور بہت پاکیزہ طباعت و کتابت کے ساتھ مجلد شایع کی گئی ہے۔ اور اس باب میں مکتبہ جدید لاہور کے ذوق کی جتنی داد دیجائے کم ہے۔ قیمت تین روپیہ۔

**نگار خانہ** ترجمہ ہے سنسکرت کی قدیم نظم نٹنی متم کا جسے میراجی نے غالباً انگریزی سے اُردو میں منتقل کیا ہے۔ یہ جنسیات کے سلسلہ کی کتاب ہے جس میں ایک تجربہ کار نائکہ نے نوجوان طوائف کو اپنے فن کے اسرار و رموز سمجھائے ہیں۔ ابتدا میں منٹو کا دیباچہ ہے جس میں انھوں نے تفصیل کے ساتھ اس کتاب کی خصوصیات پر گفتگو کی ہے۔

میراجی کے متعلق مشہور تھا کہ وہ جنسی بھوک کے مریض ہیں اس لئے قدرتاً انھیں اس کتاب کے ترجمہ کی طرف متوجہ ہونا چاہئے تھا، اور اس میں شک نہیں کہ ترجمہ انھوں نے اس خوبی سے کیا ہے کہ یہ خود ان کی تصنیف ہو کر رہ گئی ہے۔

اس کتاب کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ نہایت نفیس کاغذ پر ٹائپ میں چھاپی گئی ہے اور قیمت ڈیڑھ روپیہ۔

ملنے کا پتہ: مکتبۂ جدید لاہور۔

**بیکار دن بیکار راتیں** مجموعہ ہے عزیز احمد کے سات افسانوں کا، ان میں سے بعض کا پس منظر جنگ ہے اور بعض کا تقسیم ہند کے بعد کا فساد اور جس حد تک افسانوں کی ٹکنک کا تعلق ہے، ان کو کامیاب افسانے کہنے میں کسی کو تامل نہیں ہو سکتا۔ عزیز احمد صاحب جزئیات کی تفصیل اور واقعات کا تجزیہ بڑی خوبی سے کرتے ہیں اور کہیں کہیں مزاح کی چاشنی سے انداز بیان کو بہت پر لطف بنا دیتے ہیں۔

ان افسانوں کا پلاٹ بھی بہت دلچسپ ہے اور کردار نگاری بھی بڑی حد تک مکمل ہے۔ نتیجہ کے لحاظ سے بھی یہ افسانے بے معنی نہیں ہیں اور ان کے پڑھنے کے بعد ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ اقدارِ حیات سے اگر جذبۂ انسانیت کو علیحدہ کر دیا جائے تو اس کارگاہ عالم میں انسان کا وجود کوئی معنی نہیں رکھتا۔

کتابت و طباعت وغیرہ بھی بہت پسندیدہ ہے۔ قیمت ہے اور ملنے کا پتہ: مکتبۂ جدید لاہور۔

**۴۹ء کا بہترین ادب** اس مجموعہ کو چودھری برکت علی اور میرزا ادیب نے مرتب کیا ہے اور مکتبۂ اُردو لاہور نے خاص اہتمام سے مجلد شایع کیا ہے۔ اس میں نو ادبی مقالے، ۱۰ افسانے و ڈرامے، ۲۵ نظمیں، ۲۵ غزلیں، ۸ گیت اور دو طنزیہ مقالے شایع کئے گئے ہیں جو سب کے سب مشہور و

مستند ادیبوں اور شاعروں کی فکر کا نتیجہ ہے۔

یہ تمام چیزیں پہلے اتنے مختلف رسایل میں شایع ہو چکی ہیں، کہ ان کا مطالعہ بیک وقت بہت دشوار ہوتا، اگر انکو اس طرح یکجا نہ کر دیا جاتا۔ اس لئے مکتبۂ اُردو کی یہ کوشش یقیناً قابل قدر ہے۔ اس میں تمام مقالے انھیں حضرات کے ہیں جو کسی نہ کسی نہج سے ترقی پسند جماعت کے افراد شمار کئے جاتے ہیں، لیکن شاید اس کے معنے یہ نہ ہوں گے کہ اس جماعت کے لٹریچر سے ہٹ کر کوئی اور چیز قابل ذکر لکھی ہی نہیں گئی۔ بہتر ہوتا اگر خالص لٹریچر سے ہٹ کر دوسرے موضوع کے مقالات کا بھی انتخاب اس میں شامل ہوتا، کیونکہ ادبیات میں شعر و شاعری یا افسانہ و ڈرامہ کے علاوہ تاریخ و تذکرہ بھی شامل ہیں۔

یہ کتاب بہت اہتمام سے مجلد شایع کی گئی ہے اور ۵۰۰ صفحات کو محیط ہے۔ قیمت چھ روپیہ ہے اور ملنے کا پتہ:۔

مکتبۂ اُردو لاہور۔

**ٹھگ جلد اول** ترجمہ ہے کرنل میڈوز ٹیلر کی مشہور کتاب کا جس میں امیر علی ٹھگ کی داستان خود اس کی زبان سے بیان کی گئی ہے۔ ہندوستان کی تاریخ کا وہ حصہ جو ٹھگی کی تحریک سے متعلق ہے، بڑا دردناک حصہ ہے، لیکن اس کی تفصیل کسی کو نہ معلوم ہوتی اگر کرنل میڈوز ٹیلر کو خود امیر علی سے ملنے کا موقعہ نہ ملتا۔

امیر علی جب گرفتار ہونے کے بعد حیدر آباد کے قید خانہ میں بھیجا گیا تو مصنف نے مل کر اس کے تمام واقعات زندگی معلوم کئے اور ایسے دلچسپ اسلوب سے ان کو پیش کیا کہ جب تک ملکۂ وکٹوریہ اس کتاب کے پروف کو (جبکہ وہ زیر طبع تھی) روزانہ صبح کو نہ پڑھ لیتیں انھیں چین نہ آتا۔

اسی دلچسپ کتاب کا ترجمہ حسن عابد جعفری نے کیا ہے اور اتنی خوبی سے کیا ہے کہ ترجمہ معلوم ہی نہیں ہوتی۔ کتاب کی ضخامت ۳۰۰ صفحات کی ہے اور خاص اہتمام سے مجلد شایع کی گئی ہے۔ ملنے کا پتہ:۔ کراچی کتب خانہ۔ اولڈ کرنسی ہاؤس۔ سادھو ٹھ نیپر روڈ کراچی۔

**نشاط خاطر** مسٹر ڈیل کارنیگی جدید عملی نفسیات کے بڑے ماہر ہیں عملی نفسیات سے مراد وہ اصول ہیں جن پر عمل کر کے انسان بہت سے جسمانی و ذہنی امراض سے نجات پا سکتا ہے۔ مسٹر کارنیگی عرصہ سے اس کے تجربات کر رہے ہیں اور سالہا سال کی تحقیق و جستجو کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہونچے کہ تمام امراض کا حقیقی سبب (خواہ وہ جسم سے متعلق ہوں یا ذہن و دماغ سے) فکر و پریشانی ہے۔ یعنی اصول ہومیوپیتھی کے مطابق وہ بھی اس بات کے قایل ہیں کہ بیماری پہلے نفس میں پیدا ہوتی ہے۔ پھر کارنیگی نے صرف اسی دریافت پر قناعت نہیں کی بلکہ دماغی افکار اور ذہنی اُلجھنوں کے عملی طریقے بھی معلوم کئے اور کامل سات سال تک انکا مسلسل تجربہ کرنے کے بعد انھوں نے ایک کتاب تصنیف کی جس میں ہر قسم کی فکر و پریشانی کو دور کرنے کی تدابیر بتائی ہیں، جن پر عمل کر کے اس وقت تک لاکھوں انسان فایدہ اُٹھا چکے ہیں۔ اس کتاب میں سیکڑوں طریقے غم و الم دور کرنے کے بتائے گئے ہیں اور یہ سب کے سب تجربات پر مبنی ہیں۔

یہ کتاب کارنیگی کی اس تصنیف کا ترجمہ ہے جسے حسن عابد جعفری نے نہایت سلیس زبان میں پیش کیا ہے اور اس وقت جبکہ ہر

انسان فکر و پریشانی میں مبتلا ہے اس کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جعفری صاحب نے اس کتاب کا ترجمہ کرکے نوع انسانی کی بڑی خدمت انجام دی ہے اور ضرورت ہے کہ اس کتاب کو مدارس کے نصاب میں شامل کرکے ابتدا ہی سے بچوں کو عملی نفسیات کے ان مصدقہ تجربات کی طرف متوجہ کیا جائے۔ کتاب چونکہ بالکل واقعات پر مبنی ہے اس لئے دلچسپ بھی ہے اور ایک انسان ناول کا سا لطف اس سے اُٹھا سکتا ہے۔ ضخامت ۲۶۸ صفحات۔ طباعت، کتابت و کاغذ وغیرہ سب پسندیدہ ہے۔ قیمت پانچ روپیہ بارہ آنہ۔ ملنے کا پتہ:۔ کراچی کتب خانہ اولڈ کرنسی ہاؤس۔ سوتھ نیپیر روڈ۔ کراچی۔

**ہفت رنگ** مجموعہ ہے جناب عرش ملسیانی کی غزلوں اور نظموں کا جس کا نام انھوں نے ہفت رنگ اس لئے رکھا ہے کہ موضوع کے لحاظ سے اس میں واقعی کافی تلون پایا جاتا ہے۔

پہلے رنگ میں جس کا عنوان انھوں نے "خونِ آدم" رکھا ہے ۱۵ نظمیں شامل ہیں اور ان سب کا تعلق مظلوم انسانیت سے رکھنے والے واقعات و حالات سے ہے۔ دوسرا رنگ عشق و محبت سے تعلق رکھتا ہے، تیسرے رنگ میں واردا تی نظمیں ہیں، چوتھا تاثرات سوز و گداز سے تعلق رکھتا ہے، پانچویں کا عنوان متفرقات ہے، چھٹے کا خرابات اور ساتواں رنگ گیت کا ہے۔

عرش صاحب کو شاعری کا ذوق ورثہ میں ملا ہے اور ایک مستحق کی حیثیت سے ملا ہے۔ وہ ان شعراء میں سے نہیں ہیں جو علم سے بے نیاز رہکر شاعری کرتے ہیں، بلکہ ان کا شمار اُن پڑھے لکھے وسیع المطالعہ شعراء میں سے ہے جو لغت، عروض اور معانی وغیرہ کے نکات سے بھی واقف ہیں۔ وہ ان شعراء میں سے نہیں جو فن کو جذبات پر قربان کر دیتے ہیں یا اپنے جہل کو "ترقی پسندی" کے پردہ میں چھپانا چاہتے ہیں، انھوں نے جہاں جہاں فارسی ترکیبیں استعمال کی ہیں، اُن سے ان کی پوری "کار آگہی" ظاہر ہوتی ہے اور اسی لئے ان کے کلام میں وزن ہے اور استادانہ معقولیت!

جناب عرش کی ہمہ گیر طبیعت کا اندازہ گیتوں کی زبان سے ہوتا ہے جو پنجاب سے اس قدر دور کی چیز ہونے کے باوجود، جناب عرش کے گہوارہ کی چیز نظر آتی ہے۔ کتاب کی کتابت و طباعت بھی بہت پسندیدہ ہے۔ قیمت تین روپیہ۔ ضخامت ۱۹۲ صفحات۔

ملنے کا پتہ:۔ رہنمائے تعلیم بک ڈپو مفتی والان۔ دہلی۔

**سہیل** مجموعہ ہے جناب آغا حیدر مرزا کے چند افسانوی و ادبی مقالات کا جن میں سے بعض ٹیگور کے رنگ کے ہیں۔ مصنف نے ظاہر کیا ہے کہ اس مجموعہ میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ ان کے واردات حیات اور ذاتی تاثرات کا نتیجہ ہیں اور کتاب کے مطالعہ سے ان کے اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔

بعض مضامین اس میں ٹیگوری انداز کے ہیں اور باوجود اس کے کہ یہ رنگ اب متروک ہو چکا ہے، اس میں کافی جوش و ولولہ پایا جاتا ہے، گو ندرت نہ ہو۔

طباعت و کتابت میں خاص اہتمام کیا گیا ہے اور کتاب کو مجلد شایع کیا گیا ہے۔ حجم ۱۴۴ صفحات۔ قیمت ۱۲/ عہ

ملنے کا پتہ:۔ کتب خانہ تاج آفس۔ کراچی۔

**رعنائیاں** مجموعہ ہے جناب برج لال رعنا کی رباعیوں، غزلوں اور نظموں کا۔ رعنا بھی انھیں ادیبوں اور شاعروں میں سے ہیں، جن کو تقسیم ہند کے بعد پاکستان سے ہندوستان آنا پڑا اور جو باوجود غریب الوطن ہونے کے اپنے فطری ذوق کو بھی پورا کرتے رہتے ہیں۔

رعنا صاحب راولپنڈی کے رہنے والے ہیں اور چونکہ خود انھوں نے اپنے حالات نہیں لکھے ہیں، اس لئے ہمیں نہیں معلوم کہ اُردو شاعری کا ذوق کب اور کیونکر ان میں پیدا ہوا اور وہ ماحول کیا تھا جس نے انھیں اتنا اچھا شاعر بنا دیا۔ اس مجموعہ کا بڑا حصہ رباعیوں پر مشتمل ہے جن سے جناب رعنا کی خوش فکری اور پختگی عیاں ہے۔ رباعیوں کے بعد غزلیں اور نظمیں درج ہیں، غزلیں کم اور نظمیں زیادہ لیکن ہر چیز اپنی جگہ خوب ہے اور بڑے پاکیزہ ذوق کو ظاہر کرتی ہے۔ یہ مجموعہ مجلد مجلد شایع ہوا ہے اور مکتبہ شان ہند دہلی سے ڈیڑھ روپیہ میں مل سکتا ہے۔

**سفینہ و ساحل** مجموعہ ہے عزیز وارثی کی غزلوں کا جسے مکتبۂ شان ہند دہلی خاص اہتمام سے مجلد شایع کیا ہے جناب عزیز، حضرت نوح ناروی کے شاگرد اور اوگھٹ شاہ صاحب وارثی کے مرید ہیں۔ وارثی سلسلہ کے شعراء میں تصوف کی چاشنی بیدم شاہ مرحوم کے کلام میں زیادہ پائی جاتی تھی، لیکن وہ ریاض و خلیل کے دور کے شاعر تھے اور اس لئے ان کے کلام میں تصوف کا وہ رنگ نہیں تھا جو اصغر گونڈوی کے یہاں پایا جاتا ہے۔ عزیز وارثی، گو شاگرد حضرت نوح کے ہیں، لیکن ان کا رنگ اپنے استاد سے بالکل علٰحدہ ہے اور اصغر کا رنگ اس میں زیادہ جھلکتا ہے اور ایسا ہونا چاہیے تھا، کیونکہ عزیز وارثی کی شاعری کی ابتدا اس ماحول میں ہوئی ہے۔ جب سوچنے، سمجھنے اور کہنے کے بہت سے نئے نئے اسلوب پیدا ہو گئے ہیں۔ عزیز کے کلام کی خصوصیت اس کی کیفیت ہے جو غالباً تعرف ہے ان کے پیر و مرشد کا۔ عزیز کا کلام سخافت سے بالکل پاک ہے اور مشاعروں کی محفل سے ہٹ کر بھی ان کے کلام کو پڑھ کر لطف حاصل کیا جا سکتا ہے۔ مکتبۂ شان ہند شکریہ کا مستحق ہے کہ اس نے یہ مجموعہ شایع کر کے ایک اچھے شاعر کو ملک سے روشناس کرایا۔ قیمت ۱؎

**بیس سو گیارہ** یہ ایک طنزیہ تبصرہ ہے دُنیا کے موجودہ سیاسیات پر جس میں مستقبل کا ایک زمانہ ۲۰۱۱ء کا متعین کیا گیا ہے اور جمہوریت یوکنا پوٹاواہا سے متعلق ہے جہاں کے صدر پوپو پالنہار نے اپنے تجربات قلمبند کئے ہیں۔ یہ ترجمہ محمد خالد اختر کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ اس کا پہلا باب جو مصنف کا پیش لفظ ہے، خاص اہمیت رکھتا ہے۔

حجم ۲۲۲ صفحات۔ قیمت ۱؎ ۸ر۔ ملنے کا پتہ مکتبۂ جدید لاہور۔

**چھائیاں** انجمن ترقی اُردو (ہند) کی غالباً یہ پہلی کتاب ہے جو پوری کی پوری نہایت خوشنما ٹائپ میں طبع ہوئی ہے۔ یہ کتاب تصنیف ہے آصف علی صاحب کی جو دہلی کے بیرسٹر، کانگرسی خیال کے مشہور لیڈر تھے اور فی الحال آسام کے گورنر ہیں۔ آصف علی صاحب کے جاننے والے واقف ہیں کہ وہ ایک نہایت اچھے ادیب بھی ہیں اور یہ تصنیف ان کی یکسر ادبیات ہی سے تعلق رکھتی ہے، جو قلعۂ احمد نگر میں محبوس رہنے کے دوران میں انھوں نے لکھی تھی۔

یہ کتاب بقول ناشر زندگی کے ایک دلچسپ پہلو کا فلسفیانہ مطالعہ ہے، ہوسکتا ہے کہ ناشر کا یہ بیان صحیح ہو، لیکن چونکہ یہ کتاب بالکل ٹیگور کے گیتانجلی کے لب ولہجہ میں لکھی گئی ہے، اور کوشش کی گئی ہے اس معنویت کے پیدا کرنے کی جو نٹشے کی کتاب Thus spoke Zarathustra میں پائی جاتی ہے، اس لئے افسوس ہے کہ ہم اس کی ادبیت وفلسفیت کے امتزاج کو بالکل نہیں سمجھ سکے اور یہ کتاب ہمارے لئے بالکل ایک معمہ کی سی حیثیت رکھتی ہے۔ قیمت درج نہیں ہے۔

**بینکوں کا جائزہ** آرمیک نائرولسن مالیات کا بڑا ماہر ہے، اس نے ایک کتاب لکھی ہے جو مالیات کے اصول اور بنکوں کے طریق کار پر حرف آخر شمار کی جاتی ہے۔ اس کتاب کا ترجمہ حسن عابد جعفری بیرسٹر اور سید نظیر حیدر بی اے ال ال بی نے اُردو میں کیا ہے۔ اس میں شک نہیں مالیات اور بنکاری کے مسایل نہایت پیچیدہ ہیں اور ان کا سمجھنا آسان نہیں، لیکن اس وقت یہ ایسے مسایل ہیں جن کا سمجھنا ہر شخص کے لئے ضروری ہے۔ اس حقیقت کو سامنے رکھ کر ولسن نے یہ کتاب لکھی تھی جس میں نہایت آسان پیرایہ میں ان تمام مسایل کو اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ معمولی سا معمولی انسان بھی اسے سمجھ سکے۔

یقیناً اس کتاب کا ترجمہ بہت دشوار تھا لیکن خوشی کی بات ہے کہ فاضل مترجمین اس میں پوری طرح کامیاب ہوئے یہ کتاب کراچی کتب خانہ کراچی سے دو روپیہ میں مل سکتی ہے۔

**لکیریں** مجموعہ ہے جناب نازش پرتابگڈھی کی غزلوں کا۔ نازش صاحب کا شمار ان شعراء میں ہے جنھوں نے اپنے لئے ملک میں ایک جگہ پیدا کرلی ہے اور بربنائے استحقاق پیدا کی ہے۔ ان کا کلام اکثر مشہور رسایل میں شایع ہوتا رہتا ہے اور ملک ان سے ناواقف نہیں ہے۔

خود انھوں نے اپنی غزل گوئی کے متعلق جو اظہار خیال کیا ہے وہ یقیناً صداقت سے خالی نہیں یعنی یہ کہ وہ جو کچھ لکھتے ہیں خود انھیں کے ذاتی تاثرات کا نتیجہ ہوتے ہیں اور یہ بات ان کے کلام سے بخوبی واضح ہے۔

ان کے تغزل کا معیار کافی بلند ہے اور ان کی غزلوں میں ہم کو بہت سے اشعار ایسے مل جاتے ہیں جن کو ایک صاحب ذوق کبھی نہیں بھلا سکتا۔ مثلاً :-

رگ رگ سے دل کی، قوتِ گفتار لی گئی — جب جا کے داستانِ محبت کہی گئی
اب تک مری زباں پہ ہے لبیک کی صدا — کیا جانے کس طرح مجھے آواز دی گئی

قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ :- ایس۔ یو۔ واچ کمپنی۔ کچہری روڈ پرتاب گڈھ (اودھ)

**ہومیوپیتھک دُنیا** ماہوار رسالہ ہے جو ایک سال سے ڈاکٹر امر پرکاش اروڑا کی ادارت میں لکھنؤ سے نکل رہا ہے۔ ہومیوپیتھی علاج بالمثل کا دوسرا نام ہے جس کا موجد جرمنی کا مشہور شاہی ڈاکٹر ہنی مَن تھا۔ اب اس طریق علاج نے اتنی مقبولیت حاصل کرلی ہے کہ شرق وغرب کا شاید ہی کوئی ایسا انسان ہو جو اس سے واقف نہ ہو۔

اس طریق علاج نے اپنی آسانی، ارزانی اور علمی اصول کے لحاظ سے دُنیا میں ایک خاص جگہ پیدا کر لی ہے اور اس کی تعلیم کے بڑے بڑے ادارے شرق و غرب میں قایم ہو چکے ہیں۔

ضرورت تھی کہ اس طریق علاج کو کامیاب بنانے کے لئے ہندوستان سے بھی کوئی مفید رسالہ اُردو زبان میں رائج کیا جائے، چنانچہ اس ضرورت کو ڈاکٹر اروڑا نے پورا کیا اور بہ وجہ احسن پورا کیا۔

اس رسالہ کا خاص حصہ وہ ہے جس میں ڈاکٹر صاحب موصوف خود اپنے تجربات پیش کرتے رہتے ہیں اور اس سے علاج میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔ دوسرے مضامین بھی بہت مستند ذرایع سے فراہم کئے جاتے ہیں اور علامات کے لحاظ سے مختلف امراض کے طریق علاج بھی نہایت وضاحت کے ساتھ بتائے جاتے ہیں۔

ضرورت ہے کہ اس رسالہ کو زندہ رکھا جائے اور لوگ اس کی خریداری کی طرف توجہ کریں۔ سالانہ چندہ چار روپیہ ہے

پتہ:۔ پوسٹ بکس نمبر ۳۲۔ لکھنؤ۔

**کلیدِ بائیوکیمیسٹری** ہومیوپیتھی کے ساتھ ساتھ ایک اور طریق علاج ڈاکٹر شسلر نے ایجاد کیا جسے بارہ نمکیات کا علاج کہتے ہیں اور تجربہ سے یہ بھی ازبس مفید ثابت ہوا ہے۔ اس میں سب سے بڑی آسانی یہ ہے کہ تمام امراض کا علاج صرف بارہ دواؤں سے ہوتا ہے۔ اس طریق علاج پر بھی بڑی بڑی کتابیں اس وقت تک لکھی جا چکی ہیں۔ ڈاکٹر اروڑا نے اُردو میں اس کے اصول بیان کئے ہیں اور تمام امراض کا علاج ان دواؤں کے ذریعہ سے نہایت آسان زبان میں بتایا ہے۔ بڑی مفید کتاب ہے اور دو روپیہ میں ڈاکٹر صاحب موصوف سے پوسٹ بکس نمبر ۳۲ لکھنؤ سے مل سکتی ہے۔

**نسیمِ سحر** مجموعہ ہے ۶۶ روایات کا جنھیں عثمان حیدر مرزا ایم۔اے نے عربی سے اُردو میں منتقل کیا ہے۔ مترجم نے تمہید میں ظاہر کیا ہے کہ "یہ مختصر مجموعہ جو منتخب و مستند روایتوں پر مشتمل ہے، بزرگان سلف کی پاکیزہ زندگی کا ایک دلکش مرقع ہے اور یہ روایات زیادہ تر دوسری تیسری صدی ہجری سے تعلق رکھتی ہیں"۔

ہو سکتا ہے کہ ان روایات سے بزرگان سلف کے اخلاق پر روشنی پڑتی ہو، لیکن ان کو مستند کہنا بالکل غلط ہے۔ کیونکہ ان میں سے اکثر اساطیری رنگ کی ہیں اور حقیقت سے انھیں کوئی واسطہ نہیں۔ یہ تمام روایات تقریباً وہی ہیں جو تمام کم علم واعظوں کی زبان سے سنی جاتی ہیں اور قطعاً اس قابل نہیں کہ پڑھے لکھے لوگوں کے سامنے پیش کی جائیں۔

ہم سمجھتے ہیں کہ عثمان حیدر مرزا صاحب نے ان کا ترجمہ کر کے اسلام کی کوئی خدمت انجام نہیں دی، بلکہ سچ پوچھئے تو اسے اور رسوا کیا ہے۔ جن ماخذوں کا حوالہ دیا گیا ہے، ان میں سے اکثر ناقابل اعتبار ہیں اور ان کی حیثیت بازاری گپ سے زیادہ نہیں۔ کاش وہ وقت جو ان لغو و مہمل روایات کے ترجمہ کرنے میں ضایع کیا گیا ہے، کسی بہتر کام میں صرف کیا جاتا اور اگر روایات اسلامی ہی کو لینا تھا تو انھیں مستند روایات بھی مل سکتی تھیں۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ درج نہیں ہے۔

# مندرجۂ ذیل کتابیں نگار بک ایجنسی سے ملسکتی ہیں

## عالمِ خیال

شوق قدوائی کی مشہور مثنوی جس میں عورت کی زبان سے "فراق" "شکست امید" اور "یاس" کے زیرعنوان محبت کی بے قراریوں، مایوسیوں کی بے مثل تصویر کشی کی ہے۔ قیمت بارہ آنے

## قاسم و زہرا

شوق قدوائی کا مشہور، دلکش منظوم ڈرامہ۔ قیمت بارہ آنہ۔

## تذکرۂ کاملانِ رام پور

شوق کے مستند اور سحر کار قلم سے ریاست رامپور کی مردم خیز زمین کے تابندہ ستاروں کے حالات۔ قیمت پانچ روپیہ۔

## باغ فردوس (فسانۂ عجائب منظوم)

میر انیس کے شاگرد فردوس کے قلم سے۔ لکھنوی زبان کی پوری رنگینی و لطافت کے ساتھ۔ قیمت ایک روپیہ چار آنہ۔

## حقایقِ اسلام

مصنفہ مفتی انوار الحق ایم، اے۔ اسلام کے عقاید و روحانیت اعمال و عبادت، آداب و معاملات اور رسوم کا بیان نہایت دلنشیں طریقہ سے — قیمت تین روپیہ۔

## نغمۂ حرم

مولفہ محمد احسن وحشی نگرامی — میلاد نبوی کے مستند حالات پیغمبر اعظم کی صفات قدسیہ کی روشنی میں۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ

## مستقبل اسلام

پروفیسر دامبری کی معرکۂ آرا تصنیف "مغربی تمدن اور مشرقی ممالک" کا ترجمہ ظفر عمر کے قلم سے۔ جس میں مشہور مستشرق پروفیسر دامبری کی دلچسپ سوانحعمری بھی درج ہے۔ صفحات ۲۰۰ سے زاید۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

## عورتوں کی انشاء

شوق قدوائی کی ایک شاگرد خاتون کے قلم سے۔ جو لڑکیاں اور مستورات فن خطوط نویسی سے ناواقف ہیں، اس کا مطالعہ انھیں خطوط نویسی کی تکنیک سے واقفکار بنادیگا۔ قیمت ۸ر

## گھر بیٹھے شاعر اور نثار بنئے!

خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی کی درج ذیل کتب آپ کو بلا استاد فن شاعری اور نثر نگاری میں کامل دستگاہ پہونچائیں گی۔

شاعری کا سٹ ۴ر — اصلاح زبان اردو ۲ر — اصول اردو ۲ر
مضمون نویسی ۸ر — زباندانی ۲ر

## سوانحعمریاں

| | | |
|---|---|---|
| حیات طیبہ | غازی الدین علوی | ۴ر |
| سیرۃ النعمان | شبلی | ۸ر |
| سیرۃ احمدی | احمد حسین خان | ۷ر |
| سیرۃ رسول اللہ | نواب علی | للعہ ۸ر |
| سیرۃ آل عباس | عزیز احمد عباسی | ۴ر |

## تاریخ

تاریخ امریکہ ---- یحییٰ تنہا --- قیمت ۸ر
" اندور --- امیر احمد علوی ---- " ۸ر
" گجرات اسلامی -- غلام محمد ---- " ۸ر
" ہند (انگریزی) " " --- " ۸ر

## دواوین و مثنویات

باقیات فانی بدایونی ------- " ۴ر
مجموعہ نظم بے نظیر --- ڈپٹی نذیر احمد -- " ۸ر
مشعل ------ فراق گورکھپوری -- " ۱۲ر
ظہور رحمت --- شاد عظیم آبادی --- " ۸ر
مثنوی راہِ حق ---- " " " ۸ر
مطلع الانوار ---- برق دہلوی --- " ۸ر
تذکیر کامل --- زین العابدین --- " ۱۲ر

## سفرنامے

صراط الحمید ۲ حصے --- الیاس برنی --- " ۱۲ر
سفر سعادت --- امیر احمد علوی --- " ۸ر
سفرنامہ حرمین شریفین -- مولانا محی الدین -- " ۴ر
" شاہ ایران -- استاد نواب رامپور -- " ۸ر

## ناول

اسرار رنگون ---- برمی سیاح --- " ۱۲ر
اصرار خانم کی سازش -- رازدار --- " ۸ر
درد ------ احمد حسین خاں --- " ۸ر
سرخ حرف ---- " " --- " ۸ر
نظیر بیگم ------ " " --- " ۱۲ر
واہ ---------- " " --- " ۱۲ر

کوہ شعلہ --- احمد حسین خاں --- قیمت ۱۲ر
وہ عورت جس نے کرد کھایا " " --- " ۸ر
فل بوٹ --- عظیم بیگ چغتائی --- " ۸ر
لفٹنٹ ---- " " ---- " ۸ر
شریر بیوی ---- " " ---- " ۸ر
کنولا ۲ حصے --- شفیع خاں نیر --- " ۸ر
سورج مکھی --- خان محبوب طرزی --- " ۸ر
آفتاب --- سید نصیر حیدر --- " ۸ر

## افسانے

ہندوستان ہمارا --- بلونت سنگھ --- " ۴ر
پلکوں میں آنسو --- صدیقہ بیگم --- " ۴ر
شہر خموشاں موپاساں مترجمہ سید نصیر حیدر " ۱۴ر

## ڈرامے

آدمی --- نسیم الہ آبادی --- " ۱۲ر
انقلاب فرانس --- بارتی ---- " ۸ر
روحِ سیاست --- نور الٰہی محمد عمر --- " ۸ر

## متفرقات

ذکر طیب محمد عربی --- مشیر حسین قدوائی میلاد پاک " ۱۰ر
ہندو شعراء --- عبدالرؤف عشرت لکھنوی --- " ۸ر
آبِ بقا ---- " " " " ۸ر
لغات مصادر اردو " " " " ۱۴ر
اساس التعلیم --- مولوی عبدالحق ۔ فن تعلیم " ۴ر
مکاتیب --- محسن الملک --- خطوط " ۸ر
امداد باہمی --- منشی اظہر علی علوی ۔ معاشیات " ۸ر

## مکتوباتِ نیاز

تین حصوں میں

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو جذبات نگاری اسلامت بیان رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشا میں بالکل پہلی چیز ہیں اور جنکے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں ان اڈیشنوں میں پہلے اڈیشن کی غلطیوں کو دور کردیا گیا ہے۔ اور ۱۲۰ پونڈ کاغذ پر طبع ہوئی ہے۔ قیمت ہر حصہ کی چار روپیہ علاوہ محصول

## شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اُردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اس کی زبان دلچسپ تخیل اس کی نزاکت بیان اسکی بلندی مضمون اور اسکی انشا عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔

یہ اڈیشن نہایت صحیح اور خوشخط ہے

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

## جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے انکی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہوجاتا ہے اُردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے جس میں ہندی کلام کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں۔

قیمت بارہ آنے علاوہ محصول

## فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے دو علمی مضامین شامل ہیں:۔

۱۔ چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ

۲۔ مادئین کا مذہب

نہایت مفید دلچسپ کتاب ہے۔

قیمت ۱۔

ایک روپیہ

علاوہ محصول

## شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام انشہ بخش کیفیات اس کے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشا کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اسکی نظیر نہیں مل سکتی تازہ اڈیشن نہایت صحیح و خوشخط سرورق رنگین۔

قیمت بارہ آنے

علاوہ محصول

## فراست الید

مولفہ نیاز فتحپوری میں کے مطالعہ سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل سیرت عروج و زوال، موت و حیات صحت و بیماری، شہرت و نیکنامی پر صحیح پیشین گوئی کرسکتا ہے

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

## نقاب اُٹھ جانے کے بعد

نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے ملک کے ہادیان طریقت و علمائے کرام کی اندرونی زندگی کیا ہے اور ان کا وجود ہماری معاشرت و اجتماعی حیات کیلئے کس درجہ کم قاتل ہے۔ زبان پلاٹ و انشا کے لحاظ سے جو مرتبہ ان افسانوں کا ہے وہ صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے

قیمت آٹھ آنہ علاوہ محصول

## مذاکرات نیاز

یعنی حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایکبار اس کو شروع کردینا اخیر تک پڑھ لینا ہے۔ یہ بھی جدید اڈیشن ہے جس میں صحت اور نفاست کاغذ و طباعت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔

قیمت:۔

ایک روپیہ آٹھ آنہ علاوہ محصول

## انتقادیات (دو حصے)

حضرت نیاز فتحپوری کے انتقادی مقالات دو حصوں میں تقسیم کئے گئے تھے پہلے حصہ میں وہ مقالات تھے جن میں خاص شعرا کے کلام پر تنقید کی گئی ہے مثلاً مومن ظفر، غالب، مصحفی، نظیر، میر، سودا جوش، اصغر وغیرہ وغیرہ دوسرے حصہ میں عام ادبی و انتقادی مباحث ہیں جنکا تعلق شعر و ادب کی تاریخ سے ہے

حصہ اول ختم ہوگیا حصہ دوم طبع علاوہ محصول

## مذہب

حضرت نیاز کا وہ معرکۃ الآرا مقالہ جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ مذہب کی حقیقت کیا ہے اور یہ دنیا میں کیونکر رائج ہوا۔

اس کے مطالعہ کے بعد انسان خود فیصلہ کرسکتا ہے کہ مذہب کی پابندی کیا معنے رکھتی ہے۔

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

# "نگار" کے خاص نمبر

## جنوری، فروری ۵۰ء

نگار ۲۸ سالہ ادبی و تنقیدی خدمات کا نچوڑ جس میں ۲۲ء سے لیکر ۴۹ء تک کے تمام تنقیدی رجحانات اور انتقادی نمونوں کو واضح کیا گیا ہے، اس میں بعض ایسے اکابر شعرا کا تذکرہ و انتخاب کلام بھی شامل ہے جن کے حالات عام طور پر معلوم نہیں ہیں اور جن کا کلام نایاب ہے۔ اس میں جدید تنقیدی میلانات اور ترقی پسند نقادوں کے مقالات بھی شامل ہیں

قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

## جنوری سنہ ۴۳ء

اس نمبر میں ریاض خیرآبادی مرحوم کے کلام پر ملک کے متعدد مشاہیر نے نقد و تبصرہ کر کے بتایا ہے کہ ریاض کی شاعری کیا تھی۔

قیمت ایک روپیہ، علاوہ محصول

## فروری، مارچ ۱۹۴۶ء

جو فن انتقاد پر ملک کے بہترین اہل قلم اور ارباب فکر کے مضامین پر مشتمل ہے

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

## جنوری سنہ ۴۷ء

اس سالنامہ کا نام "ماجد لین نمبر" ہے جس میں ایک بیشل فرانسیسی ادیب کی ایک شاہکار ٹریجڈی کو اردو میں منتقل کیا گیا ہے۔ ادب اور جذبات نگاری کے لحاظ سے یہ ناول اپنا نظیر نہیں رکھتا۔

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

## جنوری، فروری سنہ ۴۸ء

پاکستان نمبر، نگار کا جوبلی نمبر جس میں دنیا کے سامنے اسلام کی عظمت رفتہ اور تمدن اسلام کے بلند حقائق کو پیش کیا گیا ہے تاکہ مسلمان اپنے مستقبل کی تعمیر و قت اسلام کے دور زریں اور ان کارناموں کو نہ بھولے جا جنہوں نے مسلم حکومت کی ترقی کی بنیاد قائم کی تھی قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

## جنوری، فروری سنہ ۴۹ء

نگار کا افسانہ نمبر ہے جس میں تقریباً تیس افسانے بہترین اہل قلم کے شامل کیے گئے ہیں اس سالنامہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اسکے مطالعہ سے بہ آسانی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ افسانہ نگاری کے کتنے اسکول ہیں اور ہر اسکول کا معیاری افسانہ کیسا ہونا چاہیئے۔ قیمت دو روپیہ۔ علاوہ محصول۔

## نرخنامہ اُجرت اشتہار

کمیشن وغیرہ کی مزید تفصیلات اور قواعد طلب کیجیے۔ "منیجر"

## "نگار" کی قیمت

سالانہ ہندوستان و پاکستان کے اندر چھ روپیہ ششماہی جاری نہیں ہو سکتا۔ سالانہ بیرون ہند بارہ روپیہ

(نوٹ) رسالہ ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ تک شائع ہوتا ہے اور وہ ۱۵ تک اطلاع آنے پر دوبارہ روانہ ہو سکتا ہے ورنہ پھر کسی طرح نہیں مل سکتا۔ "منیجر"

جواب کیلئے ٹکٹ بھیجنا ضروری ہے اور خط و کتابت میں اگر نمبر خریداری نہ دیا گیا تو تعمیل دشوار ہے

مطبوعہ نگار پریس لکھنؤ۔ ایڈیٹر و پبلشر نیاز فتحپوری